

جولائی ۲۰۰۵ء

ماہنامہ
پیشاق
لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ

بانی تنظیم اسلامی کے دورہ بھارت کے تاثرات پر بھارت کے دو دانشوروں کا تبصرہ اور اس کی جوانی و وضاحت خود بانی تنظیم کے قلم سے

راقم الحروف نے اوائل نومبر ۲۰۰۴ء سے اوائل دسمبر تک بھارت کا ایک ماہ سے زائد عرصے پر محیط دورہ کیا جس میں شمالی اور جنوبی بھارت کے اہم شہروں میں جانا ہوا۔ مثلاً شمال میں دہلی اور علی گڑھ۔ اور جنوب میں ممبئی، پونا، بنگلور اور حیدرآباد۔ پھر واپسی پر راقم نے اپنے تاثرات ایک تقریر کی صورت میں بیان کیے جو مجلہ ”میشاق“ بابت ماہ فروری ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئے۔ اس پر ایک خط تو بھارت کے معروف سیاست دان اور دانشور اور مسلمانوں کے قومی اور سیاسی رہنما جناب سید شہاب الدین صاحب کا موصول ہوا۔ اور دوسرا تبصرہ معروف عالم دین مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کا ہے جو براہ راست ہمیں ارسال نہیں کیا گیا بلکہ ۱۷ فروری ۲۰۰۵ء کے ”قومی آواز“ میں شائع ہوا۔ جس کا تراشہ ہمیں کسی کرم فرمانے ارسال کر دیا۔ ان میں سے اوّل سید شہاب الدین صاحب کا خط درج ذیل کیا جا رہا ہے:

”۱۶ فروری ۲۰۰۵ء“

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تازہ میثاق میں آپ کی تقریر کا متن زیر نظر ہے۔ آپ نے اپنے دورہ ہندوستان کے مشاہدات اور تاثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ ہر جگہ آپ کا شایان شان استقبال ہوا اور مسلمانان ہند نے گرم جوشی، عقیدت اور محبت سے آپ کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی۔ آپ نے اخیر میں

اپنی اس رائے کا اعادہ کیا ہے جس کا اظہار آپ نے مجھ سے بذات خود کیا تھا۔ میں معارف قرآن (؟) تو نہیں ہوں پر اتنا جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دونوں حالات میں آزما رہا ہے اقتدار اور محرومی، امارت اور غربت۔ ظاہر ہے کہ متمول اور با اقتدار مسلمان ان سیاسی اور اقتصادی تجربات سے نا آشنا رہتے ہیں جو مقابلتاً غریب اور اقتدار سے محروم مسلمانوں کی زندگی کا فطری معمول بن جاتے ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا وقت دے کہ آپ اس نشأۃ ثانیہ کو خود سے دیکھیں۔ پر اس کی مجموعی نوعیت کیا ہوگی، یہ کہنا مشکل ہے۔

دو واقعاتی غلطی بتانا مناسب سمجھتا ہوں، جبری نس بندی ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء کے دوران ہوئی جو ایمر جنسی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جتنی حکومتیں آئی ہیں وہ اس بات پر قائم ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی زبردستی نہیں ہوگی۔ اس لیے یہ واقعہ ۱۹۷۷ء سے دس پندرہ سال بعد کا نہیں ہے بلکہ پانچ سال بعد کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شاہ بانو کے بارے میں سپریم کورٹ کے ۱۹۸۵ء کے فیصلے کو رد کرنے کے لیے ۱۹۸۶ء میں جو قانون بنا اس کا تعلق صرف مسلم مطلقہ کے حقوق سے ہے، پر اگر آپ سپریم کورٹ کے اس کے بعد کے فیصلوں اور بالخصوص حالیہ فیصلوں پر نظر ڈالیں تو ایسے فیصلے ملیں گے جو شریعت سے ٹکراتے ہیں۔ اس کی میرے خیال میں بنیادی وجہ یہ ہے کہ دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح، یا خود ہندوستان کے ہندو کوڈ کی طرح، یہاں کوئی مسلم کوڈ نہیں ہے تو ہرج بزم خود شریعت کی تشریح پر تل گیا ہے۔ سیاسی سطح پر آزادی کے بعد ہر حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جب تک مسلمان خود نہ چاہیں، مسلم پرسنل لاء میں کوئی قانونی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

اور کئی باتیں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ اولاً دعوت آج بھی Defence Mode میں ہے، یعنی مسلمانوں کے درمیان اسلام کو نافذ (؟) کرنا یا مرتدوں کو واپس دائرہ اسلام میں لانا۔ ہندوستان میں بہت کم ہندو مسلمان ہوئے ہیں، اونچی ذات کی تعداد تو صفر کے برابر ہے اور مسلم آبادی کے اضافہ میں تبدیلی مذہب کا دخل برائے نام ہے۔

میں بڑے ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان

سب بنیادی طور پر مذہبی ذہن رکھتے ہیں اور انہوں نے سیکولرزم قبول کیا ہے تو فقط اس معنی میں کہ ریاست کا اپنا کوئی مذہب نہیں اور وہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں برتے گی۔ اس ملک کی مسلمان اقلیت چاہے بھی تو جمہوری دور میں اسلامی حکومت قائم نہیں کر سکتی، لیکن سیکولر حکومت سے اسے برابری مل سکتی ہے۔ اس کا مفاد جمہوریت کے ساتھ سیکولرزم سے وابستہ ہے، اس لیے آپ سیکولرزم کو لغوی معنی اور تاریخی پس منظر سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کریں۔ نہ وہ کفر ہے، نہ لادینیت، نہ ضد مذہبیت۔

اسلام کی نشاۃِ ثالثہ کا جو نقشہ میرے ذہن میں ہے وہ مذہبی اکثریت سے زیادہ سیاسی اور سماجی امور میں برابری کی شرکت اور علمی اور اقتصادی سر بلندی کا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی مذہب میں پیدا کرتا، مگر اگر ہماری شرکت سے ہندوستان ایک ایسی موڈل ریاست بنے جہاں سبھی مذاہب کے لوگ برابری اور امن کے ساتھ رہیں اور ہر فرقہ اور طبقے کے لیے ترقی کی راہیں کھل جائیں، جہاں سب کو انصاف ملے اور سب کی حکومت میں شرکت ہو تو یہ بھی نشاۃِ ثانیہ کہا جاسکتا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کا مطلب میری نظر میں مسلم اقتدار بلا شرکت غیرے نہیں ہے۔ ان ممالک میں بھی جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ان کو اپنی غیر مسلم اقلیتوں کو شریک اقتدار کرنا ہوگا۔ بہر حال آج مسلمان دنیا میں فقط ۱۵ فیصد ہیں۔ وہ پوری دنیا میں اسلام کیسے نافذ کر سکتے ہیں؟ مگر ہر ملک میں اپنے اخلاق و کردار کی بنیاد پر اس کو اسلامی موڈل کے نزدیک لانے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

والسلام

آپ کی دعاؤں کا محتاج

شہاب الدین

(سیّد شہاب الدین)

اس مکتوب گرامی میں اولاً کچھ معلومات — اور خصوصاً جبری نس بندی کے زمانے کے ضمن میں میری درج کردہ تاریخ کی تصحیح ہے، جس پر میں سیّد صاحب کا

ممنون ہوں۔

اس مکتوب کے اصل اور اہم تر موضوع یعنی ”سیکلورزم“ کے بارے میں تو گفتگو بعد میں مولانا قاسمی کے تبصرے کو شامل کر کے ہوگی۔ اس وقت سید صاحب نے جو دو بار ”نشأۃ ثالثہ“ کا تذکرہ کیا ہے اور دو ہی بار ”نشأۃ ثانیہ“ کی اصطلاح استعمال کی ہے اس پر عرض کرنا ہے کہ اس سے راقم کو اپنے اس نظریے کی تائید حاصل ہوئی کہ اُمتِ مسلمہ کی ”نشأۃ اولیٰ“ تو عربوں کی زیر قیادت ہوئی تھی جو ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد کے بعد زوال کی انتہا تک پہنچ گئی اور پھر ”نشأۃ ثانیہ“ ترکوں کی زیر قیادت ہوئی جو ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانی کے خاتمے کے ساتھ زوال کی اس درجہ انتہا کو پہنچی کہ اُس وقت کے لسانِ العصر اور ملٹی شاعر مولانا حالی نے فرمایا کہ:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

لیکن اب ان شاء اللہ مسلمانوں کی ”نشأۃ ثالثہ“ کا آغاز ہونے والا ہے۔ (اگرچہ اس سے قبل مسلمانوں کو اپنی بد عملیوں کی مزید شدید اور گھمبیر تر سزا ملے گی!) — اس کے برعکس اسلام کی ”نشأۃ اولیٰ“ آ محضو ﷺ کے دستِ مبارک سے ہوئی جو اپنے عروج کو خلافتِ راشدہ کے دوران پہنچی۔ لیکن خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے ساتھ ہی ”اسلام“ کا زوال شروع ہو گیا جو مسلسل بڑھتا چلا گیا، تا آنکہ آج ”غربت“ کی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ جیسے کہ الصادق والمصدق محمد ﷺ نے پیشین گوئی فرمادی تھی کہ: ”بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ!“ — البتہ اب عنقریب اس کی ”نشأۃ ثانیہ“ ہوگی۔ اور اس کی صورت بالکل وہی ہوگی جو آج سے چودہ سو سال قبل تھی۔ یعنی از روئے حدیثِ نبوی ”خلافتِ علی منہاج النبوۃ“ نہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے برابری کے اصول پر co-exist کرنے کی

صورت میں؛ جیسا کہ سید صاحب کا خیال ہے!

رہا سید صاحب کا یہ فرمانا کہ ہندوستان کی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے قبولِ اسلام کا معاملہ صفر کے برابر ہے تو اس کا اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب سیاسی آدمی ہیں، دعوت و تبلیغِ اسلام ان کا میدان ہی نہیں ہے، لہذا اس معاملے کے ضمن میں صورتِ واقعہ کا ان کے علم میں نہ ہونا قرینِ قیاس ہے۔ اس کے ضمن میں اگر پوچھنا ہے تو پوچھئے مولانا ٹمس نوید عثمانیؒ کے شاگرد اور خلیفہ سید عبداللہ طارق صاحب سے۔ اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے فرزند ارجمند اور ماہنامہ ”الفرقان“، لکھنؤ کے موجودہ مدیر سجاد نعمانی صاحب سے۔ اور بدرجہ آخردا کٹر ڈاکٹر نائیک صاحب سے جو حال ہی میں غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے میدان میں سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ بہر حال اگر سید صاحب کی بات درست ہے اور تاحال کسی قابلِ ذکر تعداد میں ہندوؤں کے مشرف باسلام ہونے کی صورت نہیں بن سکی ہے۔ تو ہمیں تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ جو دوازدہ صدی ہجری کے مجددِ اعظم تھے۔ کی پیشین گوئی سے امید ہے کہ ”ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی!“ اور ہماری دعا تو یہی ہے کہ اللّٰهُمَّ عَجِّلْ لِهَذَا الْأَمْرِ آمین!! اس ضمن میں غالباً اس واقعے کے بیان میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بھارت کے ایک ارب پتی ہندو حال ہی میں لاہور آ کر اڈالا میرے ہفتہ وار درسِ قرآن میں شریک ہوئے اور پھر مجھ سے مفصل ملاقات کے لیے میرے دفتر تشریف لائے جو اسلام تو قبول کر چکے ہیں اور جملہ شعائرِ اسلام کے پابند بھی ہیں لیکن انہوں نے تاحال اس کا اعلانِ عام نہیں کیا، اگرچہ یہ وصیت انہوں نے عدالت سے تصدیق کرا کے محفوظ کرا دی ہے کہ میری اچانک موت پر میری لاش کو جلایا نہ جائے بلکہ مسلمانوں کے طریقے پر دفن کیا جائے۔ انہوں نے اپنی دھرم پتی کو جب اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع دی اور آزادی دی کہ وہ چاہیں تو علیحدگی اختیار کر لیں تو اس پر اُس نے روایتی ہندو عورت کی طرح جو وفادار اور فی الواقع شوہر کی داسی بن کر رہنے والی ہوتی ہے، کہا کہ ”میں آپ

کی چوکھٹ سے داخل ہو چکی ہوں، اب تو اس سے میری ارتھی ہی باہر جائے گی۔” البتہ آپ یہ کریں کہ آپ میرے مذہب میں دخل نہ دیں، اور میں آپ کے مذہب اور معمولات پر کوئی اعتراض نہیں کروں گی۔“ چنانچہ ان کی رفاقت تو چل ہی رہی تھی، انہوں نے اپنے مسلمان ہو جانے کی اطلاع کی بنیاد پر ایک مسلمان خاتون سے بھی شادی کر لی جن کی نیکی سے وہ بے حد متاثر ہیں۔ لیکن میرے قیام ممبئی کے دوران اس خاتون نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھ سے دریافت کیا کہ کیا کسی شخص کا خفیہ طور پر مسلمان ہو جانا دینی اعتبار سے کافی ہے یا اس کا اعلان بھی ضروری ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اعلان ضروری ہے، اس لیے کہ اسلام کا پہلا رکن ہی نہیں اس میں داخلے کا ”شاہِ درہ“ ہی کلمہ شہادت ہے جو اعلانیہ ادا ہونا چاہیے!۔ اس پر ان صاحب سے معلوم ہوا کہ انہوں نے انہیں الٹی میٹم دے دیا ہے کہ یا تو اپنے اسلام کا اعلان کرو ورنہ میرا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ چنانچہ اسی مسئلے پر بات کرنے کے لیے وہ میرے پاس آئے تھے اور جب میں نے ان سے کہا کہ اعلان لازمی ہے تو انہوں نے کہا کہ ”مجھے اور تو کسی کی پروا نہیں ہے، صرف اپنی بوڑھی والدہ کے بارے میں ڈر ہے کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گی اور شاید ان کی موت واقع ہو جائے“ اس پر جب میں نے یہ کہا کہ ”آپ اس خیال کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے میں اس کو کہ آپ کے اعلان اسلام سے کتنی تعداد میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے اسلام لانے کا راستہ کھلے گا!“ تو اس پر ان کے چہرے پر روشنی سی آگئی اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ ”اس پر تو واقعہ پورے بھارت میں تہلکہ مچ جائے گا“ یہ وعدہ کیا کہ جلد اپنے اسلام کا اعلان کر دیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللّٰهُمَّ زِدْ اُمَّتَنَا— اے اللہ ایسی اور بہت سی مثالیں پیدا فرما! آمین!!

اور اب آئیے مولانا سید اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کے تبصرے کی جانب جو درج

ذیل ہے:

”سیکولرازم کا مثبت پہلو

سیکولرازم جدید بین الاقوامی جمہوری دور کی سیاسی اصطلاح ہے اس جدید سیاسی اصطلاح کا ترجمہ قدیم مذہبی لغت میں تلاش کرنا بڑی نادانی کی بات ہے۔

اس سیاسی اصطلاح کا مطلب و مفہوم مذہب میں غیر جانبداری ہے نہ کسی مذہب کا اقرار ہے نہ کسی مذہب کا انکار ہے، بلکہ تمام مذاہب کے لیے یکساں سلوک کرنے کا عہد ہے۔

ہمارے بعض مذہبی (خلافتی) رہنما سیکولرازم کو کفر و شرک اور طاغوت اور باطل کے معنی میں لے کر اس نظام کو حکومتِ الہیہ اور خلافتِ اسلامیہ کی ضد اور اس کا مد مقابل قرار دیتے ہیں، لیکن جب وہ سیکولر نظام حکومت میں تمام مذاہب کے ساتھ قانونی طور پر یکساں اور برابر کا سلوک دیکھتے ہیں اور مذہب و مسلک کی خون ریزی سے اور محض جزوی اور فروعی مسائل میں باہمی تصادم کے شرمناک حالات سے خدا کے بندوں کو محفوظ پاتے ہیں تو وہ ایک معقول انسان کے طور پر سیکولرازم کی تعریف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ابھی حال میں پاکستان کے شہرت یافتہ مذہبی اسکالر و خطیب ڈاکٹر اسرار صاحب ہندوستان کا طویل دورہ کر کے اور بڑے بڑے شہروں میں اپنی خصوصی خطابت کے ذریعہ مختلف مسائل پر اظہار خیال کر کے تشریف لے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ماہنامہ بیثاق (فروری) میں اس دورہ کے تاثرات بڑی تفصیل سے تحریر کیے ہیں اور ہندوستان کے سیکولرازم پر خاص طور پر تبصرہ کیا ہے۔

اس تبصرہ کی خاص بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بطور ایک قدیم خلافتی قائد کے ایک ہی سانس میں سیکولرازم کو کفر و شرک کے انتہائی مذموم القاب سے یاد کرتے ہیں اور اسی سانس میں ایک معقول انسان کی حیثیت سے ہندوستانی سیکولرازم کے مثبت پہلو کی تعریف کرتے ہیں، منفی پہلو اور مثبت پہلو کی منطقی تقسیم کا سہارا حاصل کر کے زمینی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور اعتراف کرتے

ہیں کہ ہندوستانی سیکولرازم مذہبی خون ریزی سے لوگوں کو محفوظ رکھتا ہے۔
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے ملک پاکستان میں صدر پرویز
مشرف صاحب کے ہاتھوں برپا ہونے والے انقلاب کا لحاظ کرتے ہوں اور
پاکستانی عوام کو سیکولرازم کا پیغام دیتے ہوں کیونکہ پاکستان مسلکی خون ریزی سے
لبو لہان ہو رہا ہے اور اس کا علاج ڈاکٹر صاحب ایک معقول انسان کی حیثیت
سے سیکولرازم ہی کے اندر سمجھتے ہوں۔ بہر حال جو مصلحت بھی ہو اب ڈاکٹر
صاحب کے الفاظ پر غور کرو۔

”دراصل سیکولرازم انہوں نے (ہندوستانیوں نے) ذہنی طور پر قبول کر لیا
ہے۔ سیکولرازم ہمارے نقطہ نگاہ سے کفر ہے، لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ
ہے کہ تمام مذاہب برابری کی سطح پر آ جاتے ہیں۔

یوں سمجھئے کہ ایک بڑا دائرہ ہے، اس دائرہ کے اندر کسی ملک کا سیاسی
معاشی اور معاشرتی نظام ہے اور اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں، البتہ
اس دائرہ کے پورے محیط کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے دائرے بنے
ہوئے ہیں، یہ مذاہب کے دائرے ہیں اور ان کو مساوی حیثیت حاصل
ہے۔“ (صفحہ ۲۹)

اس دورہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہندوستانی حکومت اور
ہندوستانی عوام نے جو بہترین سلوک کیا ہے اور ممبئی کے پولیس افسران نے
ویزا کے سلسلہ میں جو ہمدردانہ رویہ اپنایا ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کی وجہ بیان
کرتے ہوئے یہ الفاظ تحریر کیے ہیں کہ دراصل انہوں نے ذہنی طور پر سیکولرازم کو
قبول کر لیا ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان افسران نے ہمدردانہ سلوک
کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ الفاظ میں سیکولرازم کی تعریف
کی ہے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جو ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ موجودہ دور کے
اس غیر جانب دار سیاسی نظام کے حالات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرے گا اس کے
تاثرات یہی ہوں گے جو ڈاکٹر صاحب نے تحریر کیے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستانی سیکولرازم کے مثبت پہلو کی تعریف کرتے
ہوئے ہندوستان میں قانون کی حکومت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ملک کے بہت

بڑے ہندو مذہبی رہنما شکر آچاریہ کی قتل کے مقدمہ میں گرفتاری کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ہندوستان کے عوام میں ملکی قانون کے لیے جو احترام ہے اس کو تسلیم کیا ہے کہ اس گرفتاری پر ہندو عوام میں کوئی احتجاج پیدا نہیں ہوا۔

تجرب ہوتا ہے کہ سیکولرازم کی اس خوبی (قانون کی عمل داری) کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس غریب پر کفر و شرک کا فتویٰ لگاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو رحم نہیں آیا۔

ڈاکٹر صاحب سیکولرازم کے مثبت پہلو کی تعریف کرتے ہوئے امریکہ کے صدر مسٹر بش کے حق میں یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں؛ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ یہ ہیں: ”چنانچہ جب بش یہ کہتا ہے کہ ہم اسلام کے خلاف نہیں ہیں تو وہ اسلام کو بطور ایک مذہب کے لیتا ہے اور اس سے ان کی واقعتاً کوئی دشمنی نہیں ہے۔“

پھر ڈاکٹر صاحب نے امریکہ میں مساجد، دینی مدارس، روزہ نماز کی آزادی اور وائٹ ہاؤس میں روزہ افطاری، عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر خاص ڈاک ٹکٹوں کے اجراء کا تذکرہ کیا ہے اور پھر یہ الفاظ لکھے ہیں:

”یہ اس سیکولرازم کا مثبت پہلو ہے جو ہندوستان کے اندر جڑوں میں اتر

گیا ہے۔“

شاید ہندوستان کے جو علماء کرام صدر امریکہ کے الیکشن کے موقع پر امریکہ دعوت پر امریکہ تشریف لے گئے وہ ڈاکٹر اسرار صاحب کے اس نظریہ کے تحت تشریف لے گئے کہ امریکہ کے صدر مسٹر بش کو اسلام کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے اور امریکہ میں اسلامی ادارے، اسلامی عبادات کی آزادی اور صدر بش کی طرف سے اسلام کی پذیرائی قابل تعریف ہے۔

موصوف ڈاکٹر صاحب ابھی تک امریکہ کے نیو ورلڈ نظام کو صہیونی سازش قرار دیتے رہے ہیں اور اس امر کی مجوزہ نظام کو اسلام کے خلاف ایک عالمی سازش کہتے رہے ہیں، لیکن یہ سیکولرازم کے مثبت پہلو کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے بدل دی اور تبدیلی کی یہ ہوا پاکستان اور ہندوستان دونوں کے اندر علماء کرام کے ایک طبقہ کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔

اس پہلو سے ہندوستان کی تعریف کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کی شدید مذمت کا بھی ایک پہلو تلاش کر لیا۔ موصوف لکھتے ہیں:

”دوسری طرف پستی کا یہ عالم کہ سوشل سیورٹی کا کوئی پروگرام ہے ہی نہیں، گویا غریب کا کوئی حصہ کہیں ہے ہی نہیں..... تو اس پہلو سے وہاں پر بہت بڑی پستی کا معاملہ بھی ہے، خاص طور پر بہار اور بنگال کے صوبوں کے مسلمان انتہائی غربت کا شکار ہیں۔“

اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس دورہ میں اپنی تقریروں اور اپنی خطابت کی کامیابی کی دھن میں رہے، شاندار جلسے ہوں، شاندار استقبال ہوں، عربی کے کیوٹی وی پروگرام اور موصوف کے تنقیدی کیسٹوں کے اثرات کا جائزہ ان پر چھایا رہا۔ اور انہیں ہندوستان کے غریب طبقہ میں آنے والی تبدیلی کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور نہ مل سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اگر پیچھے مڑ کر دیکھتے جب ان کا خاندان حصار (ہریانہ) سے ہجرت کر کے پاکستان گیا اس وقت ملک کے غریبوں کی کیا حالت تھی اور آج کیا حالت ہے تو ان کا تبصرہ یہ نہ ہوتا!

راقم السطور کے نزدیک سید شہاب الدین صاحب تو قابل معافی ہیں، اس لیے کہ وہ نہ واقعہ عالم دین ہیں نہ ہی اس کے مدعی ہیں۔ لیکن مولانا قاسمی صاحب کا معاملہ حد درجہ افسوس ناک ہے کہ عالم دین ہوتے ہوئے اس بات سے صرف نظر کر رہے ہیں کہ قرآن کی رو سے ”حاکمیت“ صرف اللہ کے لیے ہے۔ ”ان الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ“۔ ”لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ“۔ ”لَهُ الْمُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ؛ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“۔ اور ”الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ“ کے ہوتے ہوئے اس معاملے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بقول اقبال۔

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے

حکراں ہے اک وہی باقی بتاں آ زری!

چنانچہ اس دور کا اصل اور سب سے بڑا شرک جسے روایتی علماء نہیں پہچان سکے، یہی ہے

کہ حاکمیت جو کبھی ٹنوں نجاست کی صورت میں فرعونوں اور نمرودوں کے سروں پر رکھی ہوتی تھی آج تولہ تولہ جدید جمہوری ریاست میں تمام شہریوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ تاہم نجاست تو بہر حال نجاست ہے، خواہ ٹن بھر ہو یا تولہ یا ماشہ بھر! — چنانچہ اُمت مسلمہ کا فرض عین ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خلاف اس ”بغاوت“ کو فرو کر کے ”حق بحق دار رسید“ کے مصداق حاکمیت اللہ ہی کو لوٹا دیں — قرآن حکیم نے تو خیر اس معاملے میں تفصیل اور صراحت کی انتہا کر دی ہے، خود بائبل کی Lord's Prayer میں یہ تصور بتمام وکمال موجود ہے کہ:

"Thy Kingdome Come!

Thy Will be done on Earth as it is in Heaven!"

یہی وجہ ہے کہ میں نے بھارت کے ہر شہر میں بانگ دہل کہا کہ سیکولرازم کفر اور شرک ہے — یہ ضرور ہے کہ اس کے ذریعے ان ملکوں میں مسلمانوں کو کچھ بہتر سلوک مل سکتا ہے جن میں مسلمان اقلیت میں ہوں^(۱) — لیکن کیا یہ دُنوی سہولتیں اور آسائشیں ہی از روئے قرآن و اسلام مسلمانوں کی زندگی کا اصل مقصد ہیں؟ راقم

(۱) چنانچہ یہ تاریخی حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ سیکولرازم اصل میں یہودیوں کی ایجاد ہے جو یورپ میں ایک حقیر سی مذہبی اقلیت تھے۔ انہوں نے ہی یہ اصطلاح وضع کی جس کا ثبوت یہ ہے کہ امریکی ڈالر کے بنیادی نوٹ پر (یعنی ایک ڈالر کے نوٹ پر) جسے یہودی بینکرز ہی نے ڈیزائن کیا تھا، ایک جانب اہرام مصر کی تصویر ہے جس کا ظاہر ہے کہ امریکی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے، جبکہ یہودیوں کے لیے یہ ایک بھیمانک یاد ہے، اس لیے کہ اس کی تعمیر کے وقت چٹانوں کے گرنے کے باعث لا تعداد یہودی جو غلاموں اور بیگار میں پکڑے جانے والے مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے تھے ان کی پسلی ہوئی لاشیں اس کی بنیادوں میں دفن ہیں — پھر اس پر ایک آنکھ بنائی گئی ہے جو از روئے حدیث نبویؐ دجال کی ایک آنکھ ہے — پھر اہرام کے نیچے قوس کی شکل میں یہ عبارت درج ہے:

”ORDOUS NOVUS SECLORUM“، یعنی ”نیا سیکولر نظام“ — چنانچہ اس نئے نظام کے ذریعے ہی یہودیوں کو یورپ اور امریکہ کے ممالک میں مساوی حقوق کے حامل شہری ہونے کی حیثیت حاصل ہوئی۔ جس سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اگرچہ بعد میں یہی فوائد ان کے ”طفیل“، مسلمان تارکین وطن کو بھی حاصل ہو گئے — چنانچہ سیکولرازم کا یہ دنیاوی فائدہ مسلم ہے، اور اس کے ضمن میں میرے اور سید صاحب یا قاسمی صاحب کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

الحروف تو قلب کی گہرائیوں اور ذہن کی تمام وسعتوں کے ساتھ اس کا قائل ہے کہ بندۂ مؤمن کی زندگی کا اصل مقصد تکبیر رب، اقامتِ دین، اظہارِ دین الحق علی الدین کله، لیکن الدین کله للہ، ”لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا“ اور قیامِ خلافت علیٰ منہاج النبوة ہے۔ بقول مولانا نصر اللہ خاں عزیزؒ۔

”مری زندگی کا مقصد ترے دین کی سرفرازی

میں اسی لیے مسلمان میں اسی لیے نمازی“

بندۂ مؤمن (واضح رہے کہ میں مسلم نہیں کہہ رہا ہوں، رجوع فرمائیں سورۃ الحجرات کی آیات نمبر ۱۲ اور ۱۵ کی جانب!) خواہ کسی حال میں ہو، اقلیت و اکثریت تو کجا، اگر کسی ملک یا بلاد میں یکہ و تنہا ہو تب بھی اسوۂ رسولؐ کے مطابق دین کی دعوت و تبلیغ اس کا فرضِ اولین ہے۔ اور اس دعوت و تبلیغ کا ہدف محض مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ نہیں بلکہ دعوت کے ذریعے ایک مضبوط جماعت (حزب اللہ) تشکیل کرنا اور مناسب قوت حاصل ہو جانے پر اللہ کے دین کی بالادستی کے لیے راست اقدام کی جانب پیش قدمی کرنا ہو!

اب ظاہر ہے کہ اس کٹھن اور پُصعوبت راہ پر چلنا تو ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، صرف غیر معمولی ہمت اور عزیمت کے حامل لوگ ہی اس کی جانب کھنچیں گے۔ اور اس لائحہ عمل پر باقاعدہ جدوجہد میں شامل ہوں گے۔ بقیہ امت کا سوادِ اعظم جمہوری اور سیکولر نظام کے فوائد سے بہرہ اندوز ہوتا رہے گا!

ویسے یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ بھارت میں سیکولرزم صرف مسلمانوں کی بہبود کے پیش نظر اختیار نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ خود غیر مسلموں کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس لیے بھی کہ ان کے پاس کوئی متبادل نظام حیات اور دستورِ مملکت ہے ہی نہیں۔ اور اس لیے بھی کہ خود ان کے مابین ذات پات کے عظیم فرق و تفاوت کے علاوہ متضاد عقائد اور مذہبی روایات بھی بجائے خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہیں۔ لہذا سیکولرزم تو ان کی مجبوری ہے۔ ویسے بھی ہندو خود مانتے ہیں کہ

ہندومت کوئی ایک مذہب نہیں ہے، بلکہ صرف ایک تہذیب و ثقافت (کلچر) کا نام ہے! رہا سید صاحب اور مولانا قاسمی صاحب کا یہ قول کہ سیکولرزم کا مطلب تمام مذاہب کی ”برابری“ ہے تو یہ بات ایک حد تک صحیح ہے — اور اس میں مذہب کو صرف انفرادی معاملہ قرار دے کر ریاست و سیاست کے میدان سے خارج کر دیا جاتا ہے — تاہم ایک تو یہ بھی واقعہ ہے کہ جملہ مذاہب کہیں بھی بالکل برابر نہیں ہوتے، بلکہ کسی نہ کسی کو ”سرکاری مذہب“ قرار دیا جاتا ہے — دوسری جانب اہم تر مسئلہ یہ ہے کہ اسلام ہرگز ہرگز صرف ایک ”مذہب“ اور انسان کا انفرادی معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ اصلاً ”دین“ ہے — جو انسانوں کی زندگی کے جملہ انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے — جبکہ سیکولرزم کو ”ہمہ مذہب“ ”لادینیت“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ ”لادینیت“ بذات خود ایک دین ہے — یعنی قرآن مجید میں وارد اصطلاحات: ”دین الملک“ (سورہ یوسفؑ) اور ”دین اللہ“ (سورہ نصر) کے مقابلے میں ”دین جمہور“ ہے، یعنی وہ نظام جس میں حاکمیت عوام کو حاصل ہوتی ہے۔ جو بالبداہت دین اللہ یعنی اسلام کی نفی ہے، از روئے آیات قرآنی: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ اور: ﴿وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ (سورہ آل عمران: آیات ۸۵، ۱۹)۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ امریکہ اور اس کا حاشیہ بردار پورا مسیحی یورپ جب یہ کہتا ہے کہ ہم اسلام کے دشمن نہیں ہیں تو ایک اعتبار سے ان کی بات صحیح ہے — اس لیے کہ وہ سیکولرزم کے اصول کے تحت اسلام کو بحیثیت ”مذہب“ سینے سے لگانے کے لیے پوری طرح آمادہ ہیں — البتہ جہاں تک اسلام بحیثیت دین کا تعلق ہے، اس کے خلاف ان کا کھلا اعلان جنگ ہے — اس لیے کہ ایسے مسلمانوں کو جو اسلام کو محض مذہب نہیں دین سمجھتے ہیں وہ ”بنیاد پرست“ (Fundamentalists) قرار دیتے ہیں جن کے خلاف ایک عالمی سرد جنگ (Cold War) شروع ہو چکی ہے — جو گاہے گاہے ”گرم“ بھی ہو جاتی ہے، جیسے کہ افغانستان میں ہوئی! (عراق کا معاملہ دوسرا ہے، وہاں کوئی فنڈا منٹلزم تھا، نہ

بڑے پیمانے پر تباہی لانے والے ہتھیار تھے اور نہ ہی صدام کا کوئی تعلق ”القاعدہ“ سے تھا۔ عراق پر فوج کشی اصل میں ”عظیم تر اسرائیل“ کی جانب پہلا قدم ہے۔ چنانچہ عراق پر امریکی حملے کی کامیابی کے وقت ایریل شیرون، وزیر اعظم اسرائیل نے برملا کہہ دیا تھا کہ ”عقرب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا!“

بہر حال سیکولرزم دین اسلام کی ضد ہے۔ اور پورے عالم اسلام کو مشرف بہ سیکولر جمہوریت کرنے کا جو ارادہ اعلانیہ ظاہر کیا جا رہا ہے وہ اصل میں دین اسلام کی بیخ کنی کرنے کا پروگرام ہے۔ اب مستقبل میں ہوگا کیا؟ یہ قطعی اور حتمی طور پر تو فی الحال صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کی پیشین گوئیوں کے مطابق مسلمان بالخصوص عربوں کو ان کی بے عملی ہی نہیں بد عملی کی بھرپور سزا دینے کے بعد نصرت الہی کے ذریعے آخری فتح مسلمانوں ہی کو حاصل ہوگی۔ اور خلافت علیٰ منہاج النبوة کا نظام پورے کرۂ ارضی پر قائم و نافذ ہو کر رہے گا۔ ان شاء اللہ العزیز!

آخر میں مولانا قاسمی مدظلہ اور دوسرے علماء کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس کیفیت سے باہر نکلنے کی کوشش کریں جو خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد سیاست و حکومت کی بلند ترین سطح سے اسلام کی بے دخلی سے شروع ہوئی تھی۔ اور پھر جب اسلام اور مسلمان دونوں دور زوال کی انتہا کو پہنچ گئے تو پھر یورپی امپیریلزم اور نوآبادیاتی (Colonial) حکومتوں کے قیام کے بعد حکومت کی سربراہی بھی مسلمانوں سے چھین گئی۔ اور عدل و قضا کے معاملات بھی علماء کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ اور اسلام۔ ”بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب۔ اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی“ کے مصداق دور غلامی میں صرف ایک ”مذہب“ بن کر رہ گیا اور اسلام کا یہ تصور ایک امر برم (Fait Accompli) کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ اور نہایت افسوس کی بات ہے کہ علماء کرام کی عظیم اکثریت تاحال اسلام کے اسی محدود تصور کو سینے سے لگائے اور حرز جان بنائے ہوئے ہے!۔

مولانا قاسمی مدظلہ کی مزید چند چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی وضاحت ہو جائے تو

مناسب رہے گا:

۱۔ بھارتی سیکولرزم ”خون ریزی“ کو تا حال بالکل نہیں روک سکا۔ باری مسجد کی شہادت کے بعد جو قتل عام خصوصاً ممبئی میں ہوا تھا اسے یاد کیجئے — اور وہ اگر ذرا پرانی بات ہو گئی ہے تو ماضی قریب میں گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کو یاد کیجئے!

۲۔ میرا سیکولرزم سے کوئی ہمدردانہ رویہ ہرگز نہیں ہے۔ میں اسے کفر اور شرک سمجھتا ہوں، البتہ اس کے ایک پہلو کو اقلیتوں کے حق میں مثبت قرار دیتا ہوں — اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ سیکولرزم سراپا خیر ہے، غلط ہے، جیسے کہ ایک کافر انسان بھی طبعاً شریف اور خادم خلق ہو سکتا ہے — اسی طرح کا معاملہ یہ ہے۔

۳۔ میں نے سیکولرزم کے بارے میں اپنی رائے ہرگز نہیں بدلی — عملاً پاکستان میں بھی تا حال انگریزی دور کے سیکولرزم ہی کا بول بالا ہے — اور یہاں مذہبی ”خون ریزی“، اگرچہ اصلاً تو بھارتی ”را“ اور اسرائیلی ”موساد“ کی کرم فرمائی ہے — تاہم اگر کوئی مذہبی عنصر اس میں شامل ہے بھی تو مسلم اور غیر مسلم کا نہیں، مسلمانوں کے اپنے فرقوں کا ہے!

۴۔ مولانا نے میری جائے پیدائش حصار کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہے کہ گویا آزادی سے قبل وہاں مسلمان اچھوتوں اور ہندوؤں کے غلاموں کی حیثیت سے اور مفلوک الحالی کے حال سے دوچار تھے — ایسا ہرگز نہیں ہے — حصار میں ہر بقر عید پر تو ہندو مسلم فساد کا ہونا ایک امر قطعی تھا، اس لیے کہ ہندوؤں کی گنہگاروں کو اعلانیہ اور ہندوؤں کو دکھا کر ذبح کیا جاتا تھا — تاہم ان فسادات میں پلڑا مسلمانوں ہی کا بھاری رہتا تھا — اور مسلمان مالی اعتبار سے ہندوؤں کے ہم پلہ تو نہیں تھے لیکن بجائے خود باعزت روزی کما کر بالعموم متوسط درجہ کی مالیاتی زندگی گزارتے تھے — البتہ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا وہ ایک علیحدہ اور ہندوستان گیر مسئلہ تھا — اور اُس وقت بھی خاص طور پر شہر حصار میں مسلمانوں کا جانی نقصان نہ ہونے کے برابر ہوا — شہر

مسلمانوں سے خالی بھی مقامی ہندوؤں نے نہیں بھارتی فوج نے کرایا۔

(۲)

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کی ایک اور ”کرم فرمائی“ حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یعنی مولانا کی وہ تحریر جو ”ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے تفسیری کیسٹوں میں لفظ جہاد کا بے محل استعمال“ کے عنوان سے دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ مجلے بابت مئی ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تحریر اس سے قبل پندرہ روزہ ”وحدت نو“ بابت جولائی ۲۰۰۴ء میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس پر حیرت ہوئی کہ اس کے بعد تو اواخر نومبر اور اواخر دسمبر ۲۰۰۴ء میں میں نے دو مرتبہ مولانا سے بالمشافہ ملاقات کی تھی۔ وہاں اس کا تذکرہ کیوں نہ آیا۔ شاید کہ اگر ام ضیف مانع ہوا ہو۔ لیکن احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں اس قسم کی سوچ کو مانع نہیں ہونا چاہیے!)

مولانا کی یہ تحریر خاصی طویل ہے۔ (یعنی بڑے سائز کے سات صفحات پر مشتمل) لہذا اسے پورا نقل کرنا تو ممکن نہیں ہے، تاہم چند باتیں مختصراً پیش خدمت ہیں:

۱۔ آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا کسی دور بلاشبہ جہاد کا دور ہے۔ اور مدنی دور جنگ اور قتال کا دور ہے (جو مولانا کے قول کے مطابق غزوہ بدر سے نہیں شروع ہوا بلکہ ہجرت کے چھ ماہ بعد ہی شروع ہو گیا تھا جب آنحضرت ﷺ نے قریش کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنانے کے لیے چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیے تھے۔ یہ مہمیں کل آٹھ تھیں جن میں سے چار میں آنحضرت ﷺ بھی شریک ہوئے تھے جنہیں غزوات، قبل از غزوہ بدر قرار دیا جاتا ہے)۔

۲۔ مولانا کا یہ فرمانا کہ: ”ڈاکٹر صاحب اپنی اس خود ساختہ تشریح میں جہاد کے لفظ کو اس کے لغوی مفہوم (جدوجہد) میں لیتے ہیں.....“ اس لیے غلط بیانی ہے کہ میں ”جہد“ کو تو واقعاً کوشش (انگریزی میں To strive for something) کے معنی میں لیتا ہوں لیکن جہاد کا مفہوم اس کے بابِ مفاعلہ سے ہونے کے ناتے فارسی

لفظ ”کشاکش“ کا لیتا ہوں جسے انگریزی میں "To struggle against something" کے الفاظ سے ادا کیا جائے گا۔

۳۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں: ”(مکی سورتوں میں) دو جگہ جہاد کا لفظ (استعمال) ہوا ہے — پہلی آیت سورہ فرقان کی ہے“ — (اس کے بعد ایک لمبی اور بے محل عبارت درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”﴿وَجِهَدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ — ”اور مقابلہ کر اُن کا اس (قرآن) کے ذریعے بڑے زور سے“۔ شاہ صاحب (شاہ عبدالقادر) بلاغت کی ایک قسم یعنی تنوع معانی اور مفہوم میں رنگارنگی پیدا کرنے کے امام ہیں۔ چنانچہ آپ نے پہلے لفظ جہاد کا ترجمہ مقابلہ تحریر کیا اور وہی لفظ مفعول مطلق کی صورت میں آیا تو اس کا ترجمہ زور (طاقت) سے کیا — ”یہاں اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ ”طاقت کے ساتھ مقابلہ“ اور ”جہاد“ میں کیا فرق ہے؟ مولانا ٹھیک فرماتے ہیں کہ نبوت و رسالت کے بنیادی فرائض تذکیر، انداز، تبشیر، وعظ، نصیحت، تبلیغ اور تعلیم و تمیین ہی ہیں — لیکن اوّل تو یہ سارے کام کسی خلا میں نہیں ہوتے، ایک ایسے ماحول میں ہوتے ہیں جہاں دعوتِ اسلامی کے مخالف اور متضاد نظریات و عقائد اور اعمال و رسومات موجود ہوتے ہیں، چنانچہ ان فرائض کی ادائیگی میں ”مقابلہ“ اور ”کشاکش“ کی صورت حال لازماً پیدا ہوتی ہے اور اسی کا نام ”جہاد“ ہے۔

۴۔ مولانا فرماتے ہیں: ”(دوسری آیت جس میں جہاد کا لفظ کسی مکی سورت میں آیا ہے وہ ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ — جن لوگوں نے خدا کی راہ میں محنت کی ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیں گے — عکبوت کی (اس) آیت میں بڑے شاہ صاحب شاہ ولی اللہ صاحب نے جہاد کے لفظ کا ترجمہ جہاد ہی سے کیا ہے، مگر شاہ رفیع الدین نے والد کی پیروی نہیں کی، کیونکہ مکی دور میں جہاد (اپنے مشہور معنی میں) موجود نہیں تھا!“

اب حیرت ہے کہ اسے مولانا کی پیرانہ سالی اور قرآن کے اٹل قوانین: ﴿وَمَنْ نَعَمَّرَهُ نَكْسُهُ فِي الْخَلْقِ﴾ اور ﴿لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ کے مطابق زوال

فہم و عقل کے علاوہ اور کس بات سے تعبیر کیا جائے کہ پوری سورت عنکبوت خصوصاً اس کا پہلا اور اہم ترین رکوع ایمان و اسلام اور کفر و شرک کے مابین ”کشاکش“ اور اس سے پیدا شدہ ابتلاء اور آزمائش اور اس کے ضمن میں صبر و مصابرت کے مباحث پر مشتمل ہے چنانچہ ایک جانب مصائب پر کسی قدر پریشانی کا اظہار کرنے والے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو فہمائش کی گئی ہے — کہ ﴿أَحْسِبَ النَّاسَ أَنْ يُنزَلُوا إِلَيْنَا أَنْ يَكُونُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ﴾ اور ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ﴾ اور دوسری جانب نوجوان مسلمانوں پر ان کے مشرک والدین کی مخالفت اور ان پر دباؤ ڈالنے کو بھی مشرکوں کے جہاد ہی سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی: ﴿وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ مَآلِيسَ لَكَ بِهِ عَلَيْهِمْ﴾ — گویا یہ دو طرفہ کشاکش تھی اور رُو در رُو مقابلہ یعنی جہاد و مجاہدہ تھا۔ اس پر بھی لفظ جہاد کے اطلاق کو غلط قرار دینا — مع ”بسوخت عقل ز حیرت کہ این چه بواجبی است!“ کے سوا اور کیا قرار دیا جائے۔

۵۔ اپنی تحریر میں مولانا نے کمال چابکدستی کے ساتھ نبی اکرم ﷺ پر نبوت اور رسالت کی تکمیل کے مظہر اتم یعنی نبوت و رسالت کے بنیادی مقاصد پر مترادف ”اظہار دین الحق علی الدین کلمہ“ کے الفاظ کو نظر انداز کیا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی شان اور بعثت محمدیؐ کے مقصد کے بیان میں قرآن میں تین بار وارد ہوئے (سورۃ التوبہ آیت ۳۳، سورۃ الفتح آیت ۲۸ اور سورۃ القصف آیت ۹) ہیں اور کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے — اور خصوصاً محقق قرآن ہونے کے باوجود سورۃ القصف کے اس وصف کی جانب بھی توجہ نہیں فرمائی کہ مقصد بعثت محمدیؐ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بیان کے فوراً بعد عذابِ جہنم سے رستگاری کی شرط لازم کے طور پر تو ”جہاد فی سبیل اللہ“ کو بیان کیا ہے (آیات ۱۰ و ۱۱) لیکن اس خاص مقصد بعثت کے آخری اور لازمی تقاضے یعنی اللہ کی راہ میں جنگ یعنی ”قتال فی سبیل اللہ“ کو محبوبیتِ خداوندی کے مقام گویا انسان کی روحانی ترقی کی بلند ترین منزل قرار دیا ہے — یہ سورۃ مبارکہ اس اعتبار سے بہت خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس چھوٹی سی سورت میں جہاد فی سبیل اللہ

اور قتال فی سبیل اللہ دونوں اصطلاحات گویا فوری تقابل یعنی simultaneous) contrast کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔

۶۔ مولانا کو لفظ جہاد سے جو وحشت محسوس ہو رہی ہے وہ اس بنا پر ہے کہ اغیار اور اعداء نے نبی اکرم ﷺ کے مشن کی تکمیل کے ضمن میں جہاد اور قتال کے مبالغہ آمیز ذکر کے ذریعے یہ پراپیگنڈہ کیا کہ ”بوائے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!“ لیکن مولانا اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں تو صاف نظر آ جائے گا کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ علماء کرام نے جہاد کو بھی ہر مقام پر جنگ ہی کے معنی میں استعمال کیا۔ اس تاثر میں کسی قدر کمی ہو سکتی ہے تو صرف اس طور سے کہ قتال فی سبیل اللہ کو تو لازماً اور لامحالہ اللہ کی راہ میں جنگ ہی سے تعبیر کیا جائے — لیکن جہاد ہر جگہ جنگ کے معنی میں مدنی سورتوں میں بھی نہیں۔ جس کی سب سے بڑی مثال سورۃ التوبہ اور سورۃ التحریم میں وارد یہ آیت مبارکہ ہے کہ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ جبکہ منافقین کے خلاف قتال یا جنگ سیرت مطہرہ سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔ اور کمال ستم ظریفی ہے کہ میری اس کوشش کی تغلیط کے ذریعے مولانا اور ان کے حلقے کے لوگ (جنہوں نے مولانا کا یہ مقالہ شائع کیا ہے) قرآن کے ”خونی کتاب“ (لائڈ جارج۔ وزیر اعظم برطانیہ) اور اسلام کے ایک پُر تشدد مذہب ہونے کے تصور کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔

۷۔ مولانا کا ایک مزید شاہکار ان کا یہ جملہ ہے: ”رسول پاک کو جو مشن دیا گیا وہ محبت سے دین کو غالب کرنے کا تھا۔ وہ مشن آپؐ نے پورا کیا۔ میدان جہاد میں ہلاک ہونے والے چند بد قسمت افراد تھے.....!!“ ایک بار پھر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ”ناطقہ سر بگمیاں ہے اسے کیا کہیے! خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!“ گویا غزوات بدر، احد، احزاب، وغیرہ وغیرہ ”محبت“ کے ساتھ لڑی گئی تھیں! — اور ایک ہزار کے لگ بھگ کافر اور مشرک جو ہلاک ہوئے وہ تو ”چند بد قسمت افراد“ تھے ہی — جو ڈھائی سو سے زائد مسلمان شہید ہوئے وہ بھی معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، نقل کفر

کفر نہ باشد” بدقسمت“ تھے۔ اسی طرح اوپر درج شدہ حکم ”وَاعْلُظْ عَلَيْهِمْ“ بھی آنحضرت ﷺ کو نہیں تھا کسی اور کو تھا۔ اب اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ۔

”خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔ ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!“

۸۔ آخری۔ اور شاہکار ترین قول یہ ہے (جس پر مولانا کا واقع مقالہ اختتام پذیر ہوتا ہے:) ”غزواتِ رسول کی عظمت اپنی جگہ ہے اس سے انکار کون کر سکتا ہے؟ مگر ان کا تعلق دعوتِ حق سے قائم کرنا درست نہیں!“ مولانا فرمائیں کہ ان کا تعلق دعوتِ حق سے نہیں تھا تو پھر کس چیز سے تھا؟ کیا ”مالِ غنیمت اور کشورِ کشائی“ سے تھا؟ تاہم مولانا کی بات اس درجہ صحیح بھی ہو سکتی ہے کہ غزوات کا تعلق دعوتِ دین سے بڑھ کر اقامتِ دین، تکبیرِ رب، قیامِ حکومتِ الہیہ، اعلائے کلمۃ اللہ، اظہارِ دینِ الحق علی الدینِ کلمہ اور ”لیکون الدین کلمہ اللہ“ سے تھا جس سے فقیہانِ حرم ذہنا نابلد اور عملاً محترز اور دستکش ہو چکے ہیں۔ فقط!

(۳)

ہم نے پہلے تو یہ لکھا تھا کہ مولانا کی یہ شاہکار تحریر پوری شائع نہیں کی جا رہی ہے۔ لیکن بعد میں خیال ہوا کہ اسے شائع کر ہی دیا جائے تاکہ قارئین ”میشاق“ بھی جوابی تبصرے سے کما حقہ محظوظ ہو سکیں۔ اور اللہ کرے کہ دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ ترجمان کے ذمہ دار حضرات بھی غور کریں کہ ایسی بے ربط تحریر کو شائع کر کے انہوں نے نہ اسلام کی کوئی خدمت کی ہے نہ خود دارالعلوم کی۔ دارالعلوم دیوبند اس وقت تو جس حیثیت میں ہے وہ علیحدہ بات ہے لیکن اس کی شاندار روایات کے پیش نظر اس تحریر کی اشاعت محل نظر ہے۔

”پاکستان کے مشہور مترجم قرآن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے تفسیری کیسٹوں میں اپنے ذاتی تحقیقی اجتہادات اور خود ساختہ فلسفیانہ عقلی نکتوں سے کام لے کر تفسیر قرآن کو جمہور اہل تفسیر کے مفہوم و مطلب کے دائرہ سے دور لے جانے کی جو کوشش کرتے ہیں اور اس عقلی جدت کو موصوف قرآن کریم کی

تفسیر کا اونچا فہم و فکر قرار دیتے ہیں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب تاریخ نبوت اور رسول پاک ﷺ کی حیات پاک کے مکی دور (تیرہ سالہ عہد) کے بارے میں یہ فرماتے ہیں اور اپنی کتابوں میں یہ تحریر کرتے ہیں کہ تیرہ سالہ مکی دور جہاد کا دور ہے اور مدنی دور جو غزوہ بدر سے شروع ہوتا ہے وہ دور قتال ہے، یعنی غزوات رسول کا دور قتل و قتال کا دور ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی اس خود ساختہ تشریح میں جہاد کے لفظ کو اس کے لغوی مفہوم (جدوجہد) میں لیتے ہیں اور اپنی تشریح کو اعتراض سے بچانے کے لیے یہ تاویل کرتے ہیں کہ جہاد کا لفظ اپنے شرعی اصطلاحی مفہوم میں نہیں ہے بلکہ لغوی مفہوم میں ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس بات پر اصرار کیوں ہے کہ وہ تیرہ سالہ مکی دور کے لیے دور جہاد کی تعبیر اختیار کریں، جبکہ قرآن کریم اس دور کے لیے جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

انذار، تنذیر، تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، شہادت علی الناس اور رسول پاک ﷺ کے لیے بھی انہی الفاظ کی صفات اختیار کرتا ہے۔

قرآن کریم نے مدنی دور کے لیے مدنی سورتوں میں جہاد کا استعمال شروع کیا ہے، اب اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

دو مقام پر جہاد کا لفظ ہے:

مکی سورتوں میں دو جگہ قرآن نے جہاد کا لفظ لغوی مفہوم (جدوجہد) میں استعمال کیا ہے اور دونوں جگہ امام المفسرین شاہ عبدالقادر صاحب اور ان کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب نے جہاد کے لفظ کا لغوی ترجمہ کیا ہے۔

پہلی آیت سورہ فرقان کی ہے، سورۃ الفرقان مکی ہے۔ حضور ﷺ نے صفاء پہاڑی پر کھڑے ہو کر عرب کے قدیم طریقہ کے مطابق اعلان کیا: ”انا النذیر العریان“ ”لوگو! میں کھلا خبر دار کرنے والا ہوں، میری بات سنو!

کسی بڑے خطرہ سے ہوشیار کرنے کے لیے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر

اعلان کرنے والا اعلان کرتا تھا اور لوگ اس غیر معمولی حالت کو دیکھ کر اس کے اعلان پر توجہ دیتے تھے یہ طریقہ کسی دشمن کے حملہ کے خطرہ سے آگاہ کرتا تھا۔
تبلیغ عام کا حکم:

اس خاص دعوت کے بعد پھر دعوت عام کا حکم نازل ہوا اور کہا گیا: ﴿يَأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۗ (آء: ۶۷)﴾ ”اے رسول! جو پیغام (توحید و نبوت) تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے عام لوگوں تک پہنچاؤ۔“
دعوت الی اللہ کا حکم:

سورہ نحل مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، اس سورۃ میں دعوت الی اللہ کا لفظ استعمال کر کے دعوت الی اللہ کے آداب واضح کئے گئے اور فرمایا: ﴿أُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (نحل: ۱۲۵) ”اے رسول! تم اپنے پروردگار کی راہ حق کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور اس میں حکمت و دانش اور با اثر و وعظ و نصیحت اور نہایت سنجیدہ و بحث مباحثہ کی پابندی کرو۔“

سورہ احزاب (۴۶) میں رسول اکرم ﷺ کو دعوت کی صفت سے موصوف کر کے داعی الی اللہ کے خطاب سے نوازا گیا۔

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۗ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ ۗ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۗ﴾ ہم نے اے رسول محترم! تم کو دین حق کی گواہی (قوی اور عملی) دینے والا، خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور دعوت حق دینے والا بنا کر بھیجا ہے اور آپ ایک روشن چراغ ہیں ان تمام صفات کے اندر۔ ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ (۵۲) ”اور مقابلہ کر ان کا اس (قرآن) کے ساتھ بڑے زور سے۔“

شاہ صاحب (شاہ عبدالقادر) بلاغت کی ایک قسم یعنی تنوع معانی اور مفہوم میں رنگا رنگی پیدا کرنے کے امام ہیں۔ چنانچہ آپ نے پہلے لفظ جہاد کا ترجمہ ”مقابلہ کر“ تحریر کیا اور وہی لفظ مفعول مطلق کی صورت میں آیا تو اس کا

ترجمہ زور (طاقت) سے کیا۔

سورہ عنکبوت مکی ہے اس میں کہا گیا: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۶۹) جن لوگوں نے خدا کی راہ میں محنت کی ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیں گے۔ جہاد کے لفظ کا لغوی مفہوم مقابلہ کرنا اور زور کے ساتھ کرنا اور محنت کرنا دونوں ترجمہ بہت اچھے ہیں۔

عنکبوت کی آیت میں بڑے شاہ صاحب شاہ ولی اللہ نے جہاد کے لفظ کا ترجمہ جہاد ہی کے لفظ سے کیا ہے، مگر شاہ رفیع الدین صاحب نے اپنے والد کی پیروی نہیں کی کیونکہ مکی دور میں جہاد (اپنے مشہور معنی میں) موجود نہیں تھا اور آیت مذکورہ میں وہ مشہور معنی مراد نہیں ہیں۔

اسلام دین دعوت ہے:

اسلام کے پہلے بنیادی دور (دور مکہ تیرہ سال) کو قرآن کریم نے دور دعوت کے طور پر متعارف کیا ہے دور اسلام کو ایک علمی مذہب قرار دے کر اسے حیاتِ انسانی کا فطری دین قرار دیا ہے۔

قرآن کریم نے اسی بنیاد پر اسلام کے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ مذہب فطرت عقل سلیم کو مطمئن کر دیتا ہے اور اس کے پھیلانے کے لیے زور و زبردستی کی اجازت نہیں ہے۔ زور و زبردستی غیر فطری اور اوہام زدہ مذاہب کے لیے کی جاتی ہے۔ مرزا غالب نے تقریر دل پذیر کی تعریف میں کہا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کو جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ یہ بھی میرے دل میں تھا

تقریر کی لذت سے آپ دین حق اسلام کی صحیح تبلیغ مراد لیجیے۔

رسول پاک کا مشن

موقعہ بے موقعہ اسلام کے تعارف و تاریخ میں لفظ جہاد کو استعمال کرنے والے اس حقیقت سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں کہ قرآن کریم نے رسول پاک ﷺ کا مشن یہ قرار دیا ہے کہ آپ محبت اور دلسوزی سے دین توحید کی اشاعت فرمائیں۔ سورہ فصلت (۳۴) میں کہا گیا: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ

وَلَا السَّيِّئَةُ ۖ اِذْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَانَهُ
 وَلِيًّا حَمِيمًا ﴿٥٠﴾ (فصلت) اے رسول محترم! برائی اور بھلائی دونوں یکساں
 نہیں، تم برائی کے جواب میں اس سے زیادہ بھلائی کیا کر دے اس کا نتیجہ تمہارے
 حق میں یہ ہوگا کہ تمہارے دشمن دوست بن جائیں گے۔

حضور ﷺ نے قرآن کی اس ہدایت پر عمل کیا اور پھر خدا کا وعدہ اپنی
 صداقت کے ساتھ ظاہر ہوا کہ آپ کے دشمن آہستہ آہستہ آپ کے دوست اور
 مومن صادق بن گئے۔ وہ مٹھی بھر دشمن جو اپنی فطرت کی سلامتی کو اپنی ہٹ
 دھرمی سے برباد کر چکے تھے وہ میدان جہاد (عذاب) میں ہلاک کر دیے گئے۔
 رسول آخر الزماں سے پہلے یہ ہوا کہ حضرات انبیاء کرام نے دعوت و
 توحید شروع کی اور ان کی قوموں نے ظلم و ستم برپا کیا اور چند نفوس کے علاوہ ان
 کی قومیں اپنی مسلسل سرکشی کے سبب مختلف قسم کے عذابوں میں ہلاک کر دی
 گئیں۔

رسول پاک کو جو مشن دیا گیا وہ محبت سے دین کو غالب کرنے کا تھا، وہ
 مشن آپ نے پورا کیا۔ میدان جہاد میں ہلاک ہونے والے چند بد قسمت
 افراد تھے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کا اپنے تفسیری بیانات میں مستقل طور پر یہ نظریہ نشر
 ہوتا ہے کہ رسول پاک ﷺ بدر کے یوم الفرقان میں فتح مند ہوئے، لیکن قرآن
 کہتا ہے کہ حضور ﷺ کو اپنے مشن (محبت و دعوت) کی راہ پر ہر قدم پر فتح حاصل
 ہوئی، کیونکہ خدا کا وعدہ آپ سے (آیت فصلت میں) یہی تھا۔

بدر و احد کی سیاسی اور فوجی فتوحات کا (تعلق) رسول پاک ﷺ اور آپ
 کے رفقاء کی جماعت کی سیاسی فتح مندی اور سیاسی غلبہ سے تھا، اسی لیے شاہ
 عبدالقادر صاحب نے یوم الفرقان کا ترجمہ فیصلہ کا دن تحریر کیا، جبکہ دوسرے
 مترجم حضرات نے امتیاز اور فتح کے الفاظ تحریر کئے ہیں۔

فرقان دفاعی فیصلہ:

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یوم الفرقان کو حضور علیہ السلام کی مطلق فتح مندی
 کا دن کہتے ہیں، یعنی حضور ﷺ اس سے پہلے غیر فاتح (نا کام) رہے۔ لیکن

حضرت شاہ ولی اللہ نے علوم نبوت کے مباحث میں یہ تحریر کیا ہے کہ اسلام پہلے دن سے مذہب فاتح تھا اور اس کی بنیاد دو علمی معجزے تھے: ایک قرآن کریم جس کے علمی چیئنج کا مخالفین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ قرآن نے چیئنج کیا: ﴿فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾ (بقرہ) اے قریش! تم قرآن کریم کی ایک سورہ جیسی سورہ بنا لاؤ، مگر قریش اس تحدی کے جواب سے عاجز رہے۔

رسول پاک ﷺ کی نبوت صادقہ بھی ایک علمی معجزہ تھا، ایک امی لقب شخص نے چیئنج کیا: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِي أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (یونس) اے قریش! میں نے تم میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا ہے۔ تو کیا ایک امی کا علوم نبوت کے اتنے عظیم و بے مثال ذخیرہ کا حامل ہونا، علمی معجزہ نہیں؟ میرا امی ہونا تم پر عیاں ہے اور پھر میری علمی عظمت بھی تم پر عیاں ہو رہی ہے۔ پس اسلام پہلے دن سے فاتح تھا، البتہ وہ فتح اقدامی تھی اور بدر کے دن میدان جہاد میں حضور ﷺ کو دفاعی فتح حاصل ہوئی، جسے سیاسی فتح بھی کہا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کا داخلہ ایک فاتح کا داخلہ تھا اور آپ نے ایک فاتح کی حیثیت سے مدینہ منورہ کی امارت کا منصب سنبھالا۔

حضور ﷺ کی امارت متفقہ تھی، مسلم اکثریت اور یہودی اقلیت دونوں کے آپ متفقہ امیر تھے۔ بدر کا غزوہ مدینہ میں داخلہ کے ڈیڑھ سال کے بعد ہوا۔

اسلام کے دو علمی معجزے:

استاذ المکرم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز بخاری شریف کے درس میں امام شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کے حوالہ سے اسلام کے ان دو علمی معجزوں پر بڑی مدلل تقریر فرمائی اور یہ ثابت کیا کہ اسلام علم و عقل اور سائنس کے موجودہ دور میں ایک زندہ اور کامیاب مذہب کے طور پر اپنی افادیت کو دنیا کے انصاف پسند دانشوروں سے تسلیم کرا چکا ہے۔

مولانا مدنی علیہ الرحمۃ نے مختلف مغربی مفکرین اور ہندوستانی دانشوروں

کے حوالہ دیئے اس ناچیز نے حضرت مدنی کے وہ افادات اپنے ادارہ (رحمت عالم) کی طرف سے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کئے ہیں۔

مغربی مفکرین میں امریکہ کے جدید مفکر مسٹر مائیکل ہارٹ کی مشہور کتاب دنیا کے سو بڑے (دی ہینڈرڈ) مولانا مدنی کے بعد منظر عام پر آئی، جس میں بڑے کھلے انداز میں مائیکل نے دنیا کے سو بڑے سماجی، سیاسی اور مذہبی رہنماؤں میں رسول پاک کو اڈیٹ کا شرف تسلیم کیا۔

یہاں تک کہ اپنے رسول حضرت عیسیٰ ﷺ کو بھی اس مقابلہ میں شامل کیا اور صاف صاف کہا کہ میری مسیحی قوم اس مقابلہ میں مجھ سے ضرور ناراض ہوگی، مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو تسلیم کرنا ایک مؤرخ کا اخلاقی فرض ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنی تقریروں اور تحریروں میں مغربی دانشوروں کے بڑے حوالہ دیتے ہیں مگر وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ یہ دانشور حضور علیہ السلام کی عظمت و فضیلت کا تعلق آپ کے دینی، روحانی، معاشرتی اور سماجی انقلاب سے قائم کرتے ہیں۔ جو انقلاب آپ کی دعوتی و تبلیغی، تعلیمی اور روحانی (باطنی، قلبی) اصلاح کے ذریعہ برپا ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ نظر یہ سے حضور علیہ السلام کی اس عظیم کامیابی کا غزوات اور تلوار سے تعلق قائم نظر آتا ہے۔

غزوات رسول کی عظمت اپنی جگہ ہے، اس سے انکار کون کر سکتا ہے؟ مگر ان کا تعلق دعوتِ حق سے قائم کرنا درست نہیں ہے۔“

☆☆☆

نوٹ: ماہنامہ ”دارالعلوم“ دیوبند میں شائع شدہ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کے مضمون میں درج قرآنی آیات کی کتابت میں جا بجا لفظی غلطیاں موجود ہیں، بعض آیات کے حوالے بھی غلط ہیں۔ ہم نے یہ مضمون شائع کرتے ہوئے ان غلطیوں کی تصحیح کر دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے قرآنی آیات محض اپنے حافظے پر اعتماد کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہیں، لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ ”دارالعلوم“ دیوبند نے بھی ان کی تصحیح ضروری نہیں سمجھی۔ (ادارہ یشاق)

حقیقتِ دین

اسلام میں

خدمتِ خلق کا تصور

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

خدمتِ خلق کا عمومی تصور: دُنوی فلاح و بہبود

جہاں تک خدمتِ خلق کے عمومی تصور کا تعلق ہے، یعنی نسلِ انسانی کے اُن افراد کی خدمت و امداد جو یتیمی یا بیوگی کی بنا پر یا کسی بیماری یا حادثے کے سبب سے یا کسی اور مجبوری و معذوری کے باعث معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں اور خود اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکیں، تو اسلامی تعلیمات میں اس پر بھی زور و تاکید میں ہرگز کوئی کمی نہیں، بلکہ میری محدود معلومات کی حد تک اس کی جتنی تاکید اسلام میں ہے اتنی نہ کسی اور مذہب میں موجود ہے نہ کسی دوسرے نظامِ فکر میں۔ تاہم اس میدان میں اسلام کی اصل (contribution) یہ ہے کہ اس نے خدمتِ خلق کے تصور کو دو ایسی نئی سمیتیں (dimensions) عطا کی ہیں جو عام طور پر اس میں شامل نہیں سمجھی جاتیں۔

اسلام میں انسانی ہمدردی کی تاکید

خدمتِ خلق کی تاکید اور اہمیت کے ضمن میں چند آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہ کا حوالہ کافی ہوگا:

(۱) مذہب کے عام رسم پرستانہ تصور (Ritualistic Concept) کے

مطابق اسلام کے بارے میں بھی عام تصور یہ قائم ہو گیا ہے کہ اس میں اصل اہمیت عبادات کی ہے۔ یہ غلط فہمی جب مزید پختہ ہوتی ہے تو عبادات کے بھی صرف ظاہری پہلو سے دلچسپی باقی رہ جاتی ہے اور ان کی اصل روح کی جانب توجہ باقی نہیں رہتی۔ ان غلط تصورات کی نفی اور تردید کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۷ سے ۷۹ جیسے آیہ برکات نام دیا جاسکتا ہے، حد درجہ اہمیت کی حامل ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾

”نیکی صرف یہی نہیں ہے کہ تم اپنے رخ مشرق و مغرب کی جانب کر لو، بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور یوم قیامت پر اور فرشتوں پر اور آسمانی کتابوں پر اور نبیوں پر، اور خرچ کیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتہ داروں پر، اور یتیموں پر، اور محتاجوں پر، اور مسافروں پر، اور سالکوں پر اور لوگوں کی گردنوں کو غلامی یا قرض وغیرہ کے بندھنوں سے آزاد کرانے میں، اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ، اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جب باہم کوئی معاہدہ کر لیں، اور خصوصاً صبر کرنے والے فقر و فاقہ پر اور مصائب و تکالیف پر اور جنگ کے میدان میں۔ یہی لوگ ہیں حقیقت میں راست باز اور یہی ہیں فی الواقع متقی۔“

اس آیت مبارکہ میں ایمان کے فوراً بعد، صلوٰۃ و زکوٰۃ سے بھی پہلے جو ارکانِ اسلام میں سے ہیں، ذکر کیا گیا ہے، بنائے نوع کی ہمدردی و مواساتہ کا اور ان کی تکالیف کے رفع کرنے یا ضروریات کے پورا کرنے میں اپنا مال صرف کرنے کا!

(۲) آیت بر میں جو بات نہایت تفصیل سے بیان ہوئی اسے حد درجہ اجمال کے

ساتھ بیان کر دیا گیا سورہ آل عمران کی آیت ۹۲ میں؛ جس سے قرآن حکیم کا چوتھا پارہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ط﴾
 ”تم نیکی کا رتبہ ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک (اللہ کی راہ میں) اپنی محبوب چیزیں نہ صرف کر سکو!“

گویا انسانی ہمدردی کے وصف کے بغیر ایک انسان خواہ عالم بن جائے، خواہ عابد بن جائے، خواہ مفسر بن جائے، خواہ محدث اور فقیہ بن جائے اور خواہ مفتی، از روئے قرآن حکیم نیک ہرگز نہیں قرار پاسکتا۔

(۳) یہی حقیقت ہے جسے آنحضرت ﷺ نے حد درجہ فصاحت و بلاغت اور ایجاز و اعجاز کے ساتھ بیان فرمایا ان الفاظ مبارکہ میں کہ:

((مَنْ يُحْرَمِ الرَّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ))^(۱)
 ”جو شخص دل کی نرمی اور رقتِ قلب سے محروم ہو گیا وہ (کل کے کل) خیر سے محروم ہو گیا!“

(۴) اس مضمون کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ اہم اور واضح مقام قرآن حکیم کے آخری پارے میں سورہ البلد میں ہے جہاں اولاً اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنے احسانات کا ذکر فرمایا ہے اور پھر شکوے کے انداز میں فرمایا ہے کہ: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعُقَبَةَ﴾^(۱) ”انسان گھائی کو عبور نہ کر سکا“۔ پھر سوال کیا: ﴿وَمَا اَدْرَاكَ الْعُقَبَةَ﴾^(۲) ”تم جانتے ہو کہ وہ گھائی کون سی ہے؟“ پھر جواباً ارشاد فرمایا: ﴿فَكُ رَقَبَةً﴾^(۳) اَوْ اِطْعَمَ فِى يَوْمٍ ذِى مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴾^(۴) ”گردنوں کا بندھنوں سے چھڑا دینا، اور قحط کے ایام میں کھانا کھلانا، کسی یتیم کو جو قربت دار بھی ہے اور کسی محتاج کو جو مٹی میں رُل رہا ہے“۔ اور اس کے بعد فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾^(۵)

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الرفق۔ و سنن ابن ماجہ، کتاب

”پھر شامل ہوا وہ اُن لوگوں میں جو ایمان لائے اور جنہوں نے باہم ایک دوسرے کو نصیحت کی صبر کی اور ایک دوسرے پر شفقت و رحمت کی!“ گویا یہاں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کو مقدم کر دیا گیا خود ایمان پر جو دین کی اہم ترین اور بنیادی حقیقت ہے۔ اس سے اصلاً اشارہ کیا گیا ہے اس حقیقت کی جانب کہ ایمان کا بیج صرف اُن لوگوں کی شخصیتوں میں پوری طرح بار آور ہوتا ہے جن میں انسانی ہمدردی کا یہ بنیادی وصف موجود ہو۔ اس کے برعکس بخیل اور کٹھوردل لوگوں کے دل کی زمین خود ایمان کے بیج کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔

(۵) آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ جو دراصل قرآن ہی کی تفسیرِ کامل ہے، اسی حقیقت کی نمایاں ترین مثال ہے۔ آغازِ وحی سے قبل آنحضرت ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں یہ تمام اوصاف، تمام و کمال و بدرجہ اتم موجود تھے۔ چنانچہ جب پہلی وحی آئی اور آپؐ پر بنائے طبعِ بشری کسی قدر گہرا ہٹ طاری ہوئی تو آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ اُمّ المؤمنین حضرت خدمتِ الکبریٰ ﷺ نے انہی الفاظ میں آپؐ کو دلاسا دیا کہ:

”اللہ آپ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا“ آپ یتیموں اور یتیموں کی سرپرستی فرماتے ہیں محتاجوں اور مسکینوں کی دستگیری فرماتے ہیں اور مسافروں اور بے آسرا لوگوں کی خدمت کرتے ہیں“۔

اور اسی کا کامل پرتو اور مکمل عکس ہے حضرت صدیق اکبرؓ کی سیرت میں کہ جب آپ ﷺ ہجرتِ حبشہ کے ارادے سے مکہ سے نکلے تو ابن الدغنه یہ کہہ کر باصرار انہیں واپس لے آیا کہ:

”ہم ہرگز آپ کو جانے نہیں دیں گے۔ آپ تو غریبوں اور مسکینوں کے نمگسار اور یتیموں اور یتیموں کی سرپرست ہیں“۔

(۶) یہی سبب ہے کہ قرآن حکیم جملہ اخلاقِ حسنہ کی جزا اور اساس ”جو دو سٹخا“ کو قرار دیتا ہے اور تمام اوصافِ رذیلہ کی بنیاد بخل کو ٹھہراتا ہے، جیسے سورۃ اللیل میں فرمایا:

﴿فَمَا مَنَ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنِيسِرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝
وَأَمَّا مَنَ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنِيسِرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝﴾

”پس جو جو دوسرا اور تقویٰ سے متصف ہے اور ہر اچھی بات کی تصدیق کرتا ہے
اسے تو ہم رفتہ رفتہ سب سے بڑی آسانی (یعنی جنت) تک پہنچادیں گے۔ اور
جو بخیل ہے اور بے پرواہی اختیار کرتا ہے اور اچھی بات کی تکذیب کرتا ہے تو
اسے ہم رفتہ رفتہ سب سے بڑی مشکل (یعنی دوزخ) کا نوالہ بنا دیں گے۔“

(۷) قرآن حکیم کی ان آیات مبارکہ پر اگر اضافہ کر لیا جائے ان احادیث
نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کہ آپؐ نے فرمایا:

(i) ((الَّذِينَ النَّصِيحَةَ))^(۱)

”دین تو نام ہی خیر خواہی کا ہے۔“

(ii) ((خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ))^(۲)

”لوگوں میں سے بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ
پہنچاتا ہے۔“

(iii) ((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ))^(۳)

”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی
کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔“

(iv) ((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِي يَشْبَعُ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَىٰ جَنْبِهِ))^(۴)

”مومن کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ خود پیٹ بھر لے در آنحالیکہ اس کا پڑوسی
بھوکا ہو۔“

تو بات بالکل کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اسلام انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق پر کس

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب الدین النصیحة للہ ولسوله ولائمة المسلمین
وعامتهم۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحة۔

(۲) صحیح الجامع الصغیر، ح ۳۲۸۹۔ بحوالہ طبرانی ودارقطنی۔ امام البانی نے اسے حسن قرار
دیا ہے۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لآخیه ما یحب لنفسه۔
وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لآخیه۔

(۴) رواہ البیہقی فی شعب الایمان (بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الشفقة
والرحمة علی الخلق)

قدر زور دیتا ہے! اس ضمن میں چوٹی کی حدیث وہ ہے جس کی رو سے کل مخلوق کو خدا کا کنبہ قرار دیا گیا ہے:

((الْخَلْقُ عِيَالُ اللَّهِ، فَاحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللَّهِ مَنْ أَحْسَنَ إِلَى عِيَالِهِ))^(۱)

”تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، پس مخلوق میں اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ بھلائی کرے۔“

اور اسی کی شرح ہے جو بیان ہوئی ایک حدیثِ قدسی میں جس کی رو سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ انسان سے شکوہ کرے گا کہ:

”مفہوم حدیث) اے میرے بندے! میں بھوکا تھا، میں نے تجھ سے کھانا مانگا، لیکن تو نے مجھے کھانا نہ دیا۔ اے میرے بندے! میں تنگ تھا، میں نے تجھ سے کپڑے مانگے، لیکن تو نے مجھے کپڑے نہ پہنائے۔“ جس پر بندہ اظہارِ تعجب کرے گا کہ ”اے رب! تو تو ان تمام احتیاجات سے پاک ہے!“ تو اللہ فرمائے گا کہ ”میرے فلاں فلاں بندوں نے جب تیرے سامنے دستِ سوال دراز کیا تھا تو ان کے پردے میں اصل سائل میں ہی تو تھا! اگر تو ان بندوں کی ضروریات پوری کر دیتا تو آج اپنے ان اعمال کو میرے پاس موجود پاتا۔“^(۲)

گویا قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں بالکل غلط نہیں کہا جس نے کہا کہ:

درِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کڑ و بیاں

اور:۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بسیح و سجادہ و دلق نیست!

اور: مع

دل بدست آور کہ حج اکبر است

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان (مجموعہ مشکوٰۃ المصابیح)

(۲) دیکھئے: صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عیادۃ المریض۔

خدمتِ خلق کے تصور کی تکمیل

لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، اس میدان میں اسلام کی اصل contribution یہ ہے کہ اس نے خدمتِ خلق کے تصور کو دو نئے اعراض و ابعاد یعنی dimensions عطا کیے۔ جن میں سے ایک کا تعلق ہے اسلام کے اساسی نظریات و معتقدات سے اور دوسرے کا تعلق ہے انسان کے نظامِ اجتماعی سے۔

اُخروی فوز و فلاح

چونکہ اسلام کے نزدیک انسان کی اصل زندگی دُنویٰ زندگی نہیں بلکہ اُخروی زندگی ہے جو ابدی و لامتناہی ہے، جو اے الفاظِ قرآنی: ﴿وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ﴾ (الاعلیٰ) ”آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی“ — اور: ﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (العنکبوت) ”اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، کاش کہ انہیں معلوم ہوتا“ — اور بقول علامہ اقبال:۔

تو اسے پیانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہردم جو اں ہے زندگی!

لہذا اسلام کے نزدیک اصل فلاح و بہبود اور حقیقی کامیابی و کامرانی آخرت کی فلاح و بہبود اور آخرت کی کامیابی و کامرانی ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اسلام میں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کے تصور میں ایک بالکل نیا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ہے انسانوں کی اُخروی نجات اور اُخروی فوز و فلاح کی فکر اور اس کی سعی و جہد! اور ظاہر ہے کہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر تو زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں تب تو اصل فلاح و بہبود یہیں کی فلاح و بہبود اور اصل عیش و آرام اسی دنیا کا عیش اور آرام ہے۔ بقول شاعر۔

”باہر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!“

اور خدمتِ خلق کا تصور بھی اسی حد تک محدود رہے گا کہ بھوکوں کو کھانا کھلا دیا جائے،

نگنوں کو کپڑے پہنا دیے جائیں، بیماروں کی دوا دارو اور علاج معالجے کا بندوبست کر دیا جائے، محتاج گھر اور یتیم خانے کھول دیے جائیں، معذور لوگوں یعنی اندھوں، بہروں، لولوں، لنگڑوں اور ناقابل علاج امراض میں مبتلا لوگوں کے آرام و آسائش اور دل داری و دلجوئی کا اہتمام کیا جائے، لیکن اگر معاملہ دوسرا ہے اور اصل زندگی موت کی سرحد کے پار واقع ہوئی ہے اور وہ ”جاوداں“ بھی ہے اور ”پیہم دواں“ بھی تو اصل حقیقت وہ قرار پائے گی جو غزوہٴ احزاب کے موقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس زبانوں پر بایں الفاظ جاری ہوئی کہ۔

اللَّهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةِ
(اے اللہ! آخرت کے عیش کے سوا کوئی عیش نہیں!)

گویا اصل عیش ہے تو صرف آخرت کا اور اصل آرام و چین ہے تو صرف وہاں کا۔ اور اصل فوز و فلاح ہے تو اخروی اور اصل کامیابی و کامرانی ہے تو آخرت کی۔ چنانچہ خلق کی اصل خدمت بھی یہ ہوگی کہ اس کی آخرت و عاقبت سنوارنے کی فکر کی جائے اور اسے ہمیشہ کے عذاب سے بچا کر دائمی امن و سکون اور آرام و اطمینان کی راہ پر ڈالا جائے۔ اور اصل خادم خلق وہ ہوگا جو خلق کی ہدایت کے لیے کوشاں ہو اور اس کی ابدی و سرمدی فوز و فلاح کے لیے اپنی جان، اپنا مال، اپنی قومیں اور صلاحیتیں اور اپنا وقت صرف کرے! چنانچہ یہی ہے خدمتِ خلق کا وہ تکمیلی مرحلہ جس میں صرف ہوا آغازِ وحی کے بعد سے آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ اور جس میں صرف ہوئیں آپ کے جسم و جان کی جملہ قومیں اور توانائیاں! اور اس میں اس درجہ انہماک تھا آپ کو کہ نہ صبح اس سے فارغ تھی نہ شام اور نہ دن اس سے خالی تھا نہ رات! چنانچہ دن کے اوقات میں اس کے لیے سرگرمی اور دوڑ دھوپ تھی دعوت و تبلیغ اور انداز و تبشیر کی صورت میں تورات کی گھڑیوں میں اسی کے لیے مشغولیت تھی اللہ تعالیٰ سے خلق کی ہدایت کی دعا و استدعا کی شکل میں! فَصَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا. وَفَدَاهُ آبَاءُ نَا وَأُمَّهَاتُنَا!!

اسی کیفیت کو ایک تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے آنحضرت ﷺ نے کہ:
 ”میری اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ آگ کا ایک بہت بڑا گڑھا ہے جس
 میں تم گر پڑنا چاہتے ہو اور میں تمہیں تمہارے کپڑے پکڑ پکڑ کر گھیٹ
 رہا ہوں!“

اس کیفیت کا احساس کسی درجے میں ہم خود بھی کر سکتے ہیں کہ اگر سڑک پر کوئی اندھا جا
 رہا ہو اور ہم دیکھیں کہ آگے گڑھا ہے جو اس غریب نابینا انسان کو نظر نہیں آ رہا تو کون
 خادم خلق ہوگا جو اسے چیخ کر خبردار کرنے اور اگر وہ بہرا بھی ہو تو دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ
 کر روکنے کی کوشش نہ کرے گا! بس اسی پر قیاس کر لیجیے کہ اگر کسی کی باطنی جس بیدار ہو
 جائے اور وہ آگ کے اس عظیم گڑھے کا مشاہدہ اپنی باطنی بصیرت سے کر لے جسے جہنم
 کہتے ہیں اور جس کی جانب بے خبری و لاعلمی میں اس کے دوست، احباب، اعزہ، اقربا،
 حتیٰ کہ تمام ابنائے نوع پورے جوش و خروش کے ساتھ بڑھے جا رہے ہوں تو کیا وہ
 دیوانہ وار اُن کو خبردار کرنے کی کوشش نہ کرے گا اور اپنی تمام توانائیاں اور قوتیں نوع
 انسانی کو اس دردناک انجام سے بچانے میں نہ کھپا دے گا اور کیا اس کی اس وارفتگی
 میں بھوکوں کے پیٹ بھرنے اور ننگوں کے تن ڈھانپنے کی فکر بھی وقتی طور پر دب کر نہ رہ
 جائے گی؟ اس لیے کہ کسی کی پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ بجھانے سے کیا حاصل
 اگر وہ کُل کا کُل آگ کا نوالہ بنا جا رہا ہو! اور کسی کی کسی وقتی اور فوری تکلیف اور
 عارضی احتیاج کو رفع کرنے کا کیا فائدہ جبکہ وہ دائمی اور مستقل عذاب کے راستے پر
 سرپٹ دوڑا جا رہا ہو۔ تاہم یہ بات میں نے صرف بغرض تفہیم عرض کی ہے ورنہ منطقی
 طور پر درست ہونے کے باوجود یہ بات مطابق واقعہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں
 جب دعوت و تبلیغ کا اصل محرک ہی خلق خدا کے ساتھ خلوص و اخلاص اور ان کی خیر خواہی و
 ہمدردی کا جذبہ ہے تو کیسے ممکن ہے کہ کوئی داعی حق کسی کو تکلیف میں دیکھے اور تڑپ
 نہ اٹھے اور اگر اُس کی تکلیف رفع کرنے پر کسی درجہ میں قادر ہو تو تن من دھن سے
 اس پر آمادہ نہ ہو جائے۔ بقول شاعر۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

یہ عرض کرنا غالباً تحصیل حاصل شمار ہوگا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے بعد انسان دوستی، اپنائے نوع کی ہمدردی اور خدمتِ خلق کے اس ابتدائی اور عمومی اور اسلام کے نظامِ معتقدات کی رُو سے تکمیلی تصورات کی جامعیت کے نمونے نظر آتے ہیں صرف صوفیائے کرام کی شخصیتوں میں، جن کی دعوت و تبلیغ کا اصل محرک صرف خلقِ خدا کی خیر خواہی کا جذبہ تھا اور جن کی زندگیاں اس امر کا منہ بولتا ثبوت تھیں کہ وہ انسان دوست بھی ہیں اور خادمِ خلق بھی۔ مزید برآں یہ عرض کرنا بھی غیر ضروری ہی سا معلوم ہوتا ہے کہ خدمتِ خلق کے دونوں تصور کسی طرح بھی ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے، بلکہ ہر اعتبار سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور جس طرح خلق کی ہدایت اور اُس کی اُخروی فلاح کے لیے تبلیغ و دعوت صرف وہ درست ہے جس کی بنیاد میں خدمتِ خلق کا جذبہ کارفرما ہو اسی طرح خدمتِ خلق بھی صرف وہی حقیقی اور واقعی ہے جس کے ساتھ اپنائے نوع کی ہدایت و نصیحت اور اُن کی ابدی و سرمدی فوز و فلاح کا پہلو بھی موجود ہو۔ ورنہ صرف دُنوی فلاح و بہبود کے کام بھی بسا اوقات صرف اپنی ذات کی projection اور اپنی اُنا کی تسکین۔ اور حصولِ شہرت بلکہ جاہ پسندی اور اقتدار طلبی کے ذرائع بن کر رہ جاتے ہیں۔

قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی

فکرِ اسلامی نے خدمتِ خلق کے تصور کو ایک مزید سمت (dimension) قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی کی سعی و جہد کی صورت میں عطا کی ہے، یعنی ایک ایسا عادلانہ و منصفانہ معاشرہ برپا کیا جائے اور ایک ایسا مبنی بر قسط و عدلِ نظامِ اجتماعی قائم کیا جائے جس میں کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرے، چنانچہ نہ سیاسی جبر اور حاکمانہ استبداد (Political Repression) باقی رہے نہ مالی و معاشی استحصال (Economic Exploitation)۔ اس لیے کہ جتنی سفیہانہ و احمقانہ بات یہ

ہے کہ گندگی کے ڈھیروں اور بیماری کے منبجوں اور سرچشموں سے تو کوئی تعرض نہ کیا جائے اور سارا زور دوا دارو اور علاج معالجے ہی پر صرف کر دیا جائے اتنی ہی نادانی اور سادہ لوحی پر مبنی ہے یہ بات بھی کہ ایک ظالمانہ نظام کو تو قائم رکھا جائے البتہ اس ظلم کی پچکی میں پس کر معذرو رو بے بس ہو جانے والے لوگوں کے لیے محتاج گھر کھول کر اپنی جھوٹی نیکی اور کھوٹی رحم دلی کے جذبہ کی تسکین کا اہتمام کیا جائے — یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کارِ نبوت اور فریضہ رسالت کے ہدف و مقصد کی تعبیر کی گئی ان الفاظ سے کہ:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحديد: ۲۵)

”اور ہم نے بھیجے اپنے رسول واضح تعلیمات اور بین نشانیوں کے ساتھ اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب و شریعت بھی اور اتارا ایک متوازن نظام اجتماعی بھی تاکہ لوگ قائم ہوں عدل و قسط پر۔“

اور اُس نظام عدل اجتماعی کے قیام و نفاذ کے لیے ضرورت پڑنے پر لوہے کی قوتِ حرب و ضرب کے استعمال کو تعبیر کیا گیا اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد و نصرت ایسے اعلیٰ و ارفع مقام اور مرتبے سے، از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ﴾

”اور ہم نے اتارا لوہا جس میں حرب و ضرب کی شدید صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے بعض دوسرے فوائد بھی تاکہ اللہ دیکھے کہ کون ہیں وہ لوگ جو مدد کرتے ہیں اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔“

اور یہی سبب ہے اس کا کہ سورۃ البقرۃ کی جس آیتِ بَرّ کا حوالہ میں نے بالکل آغاز میں دیا تھا اور جو قرآن حکیم میں نیکی اور تقویٰ کی حقیقت کے موضوع پر جامع ترین آیت ہے اُس میں ایمان کے بعد نیکی کے مظاہر عملی میں ابتدا میں ذکر ہوا انسانی ہمدردی اور خیرات و صدقات میں اپنا محبوب مال صرف کرنے کا اور اُس کا اختتام

ہوا میدانِ جنگ میں صبر و مصابرت کے ذکر پر۔ گویا از روئے قرآن حکیم نیکی کی چوٹی یا ”ذروة السنم“ یہ ہے کہ دین حق یا نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام و نفاذ کے لیے انسان نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے اور پھر کسی صورت میں قدم پیچھے نہ ہٹائے! — چنانچہ یہی ہے وہ بات جو فرمائی تھی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فاتحِ ایران نے سپہ سالارِ افواجِ ایران کے اس سوال کے جواب میں کہ جب فی الوقت ہمارے اور تمہارے مابین کوئی نزاع موجود نہیں ہے تو تم لوگ کیوں ہم پر چڑھ آئے ہو؟ حضرت سعدؓ نے جواب دیا:

”إِنَّا قَدْ أُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلْمَتِ الْكُفْرِ وَالْجَهَالَةِ إِلَى نُورِ الْإِيمَانِ وَمِنْ جُورِ الْمُلُوكِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ“
یعنی ”ہم اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ لوگوں کو کفر و جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لائیں اور بادشاہوں کے ظلم و ستم کے پنجے سے نجات دلا کر اسلام کے عدل سے روشناس کریں!“

حضرت سعدؓ کے اس جملے میں ایک جانب تو اشارہ ہو گیا اس حقیقت کی طرف کہ ”میں آیا نہیں لایا گیا ہوں!“ کے مصداقِ اسلام کے صدرِ اول میں مسلمان خود کسی ”مالِ غنیمت یا کشورِ کشائی“ کے شوق میں نہیں نکلے تھے بلکہ ان کا نکلنا خالصتاً خدائی حکم کے تحت گویا ”ما مور من اللہ“ ہونے کی حیثیت سے تھا اور دوسری جانب اس ایک جملے میں بیک وقت جمع ہو گئے فکرِ اسلامی اور تعلیمِ قرآنی کے وہ دونوں پہلو جنہیں میں نے خدمتِ خلق کے تصور کے ضمن میں اسلام کی عطا کردہ دو نئی سمتوں (dimensions) سے تعبیر کیا ہے!

یہاں یہ مغالطہ نہ ہو کہ اسلام نے شاید صرف سیاسی حقوق ہی پر زور دیا ہے۔ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اسلام نے اصل زور معاشی عدل و انصاف اور سرمایہ و دولت کی منصفانہ تقسیم اور ذرائع پیداوار پر تصرف کے عادلانہ نظام پر دیا ہے اور اس ضمن میں اپنے ہدفِ مطلوب اور صحیح مقصود کو تعبیر فرمایا ہے ان مبارک اور جامع الفاظ سے کہ:

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر: ۷)

”ایسا نہ ہو کہ سرمایہ تہارے دولت مندوں ہی کے مابین گردش میں رہے۔“

یعنی یہ نہ ہو کہ ملک کی کل دولت سمٹ کر چند خاندانوں یا ایک مخصوص طبقے کے قبضہ و تسلط میں چلی جائے جن کا باہمی لین دین لاکھوں اور کروڑوں کے حساب سے ہو، چنانچہ ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب پر لاکھوں صرف ہو جائیں اور دوسری طرف ایک طبقہ ایسا وجود میں آجائے جسے نان جو میں کے بھی لالے پڑے ہوں اور پھر وہ حرام اور سراسر ظلم و نا انصافی سے کمائی ہوئی دولت کی بنا پر وجود میں آئے ہوئے لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگ اپنی دیگوں کی کھر چن ان بھوکوں کے سامنے ڈال کر حاتم طائی کی قبر پر لات ماریں اور اپنے جو دو سخا کے دل خوش کن تصور سے شاد کام ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صاف واضح فرما دیا کہ حرام کی کمائی سے صدقہ و خیرات خدا کے یہاں بالکل مقبول نہیں ہے:

((إِنَّ اللَّهَ طَيِّبٌ وَلَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا))^(۱)

”اللہ خود پاک ہے اور صرف پاک چیز ہی قبول کرتا ہے۔“

حتیٰ کہ حرام خورکی دعا بھی اللہ کے یہاں مقبول نہیں:

((.....وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَعُدْيَتِي بِالْحَرَامِ
فَأَنِّي يُسْتَجَابُ لِدَلِكِ))^(۲)

”..... جبکہ اس کا کھایا ہوا بھی حرام کا ہے، پیا ہوا بھی حرام کا ہے، پہنا ہوا بھی حرام

کا ہے، اور اس کا سارا تن و توش حرام کی غذا سے تیار ہوا ہے، تو اس کی دعا قبول

ہو تو کیسے؟“

جبکہ دوسری طرف تصور دیا گیا کہ حلال کی کمائی سے انسان اگر اپنی بیوی کے منہ میں بھی لقمہ ڈالتا ہے تو اللہ کے یہاں اسے بھی صدقہ قرار دیا جاتا ہے! — اور یہی سبب ہے

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب و تریبہا۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ، باب ومن سورة البقرة۔ ومسند

احمد، کتاب باقی مسند المکثرین، باب باقی المسند السابق۔

کہ اسلام کے نظامِ خلافت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے وہ بات جسے خلیفہٴ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا بیعتِ خلافت کے بعد اپنے پہلے خطبے میں بایں الفاظ کہ: ”تم میں سے ہر کمزور میرے نزدیک قوی ہوگا جب تک اُسے اس کا حق دلوانہ دوں اور ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہوگا جب تک اُس سے حق وصول نہ کر لوں!“ اور بالکل صحیح کہا ہے علامہ اقبال مرحوم نے ”نکتہٴ شرع میں“ کی اس وضاحت میں کہ

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتہٴ شرع میں ایں است و بس!

الغرض جس طرح ”prevention is better than cure“ کے مسلمہ اصول کے مطابق حفظانِ صحت کی جملہ تدابیر اختیار کر کے بیماری کا انسداد و سدِّ باب کرنا اہم تر اور مقدم تر ہے؛ البتہ اس کے باوجود جو بیماریاں پیدا ہو ہی جائیں ان کے ضمن میں علاجِ معالجے کا اہتمام بھی ضروری ہے؛ اسی طرح نظامِ اجتماعی کو ان تمام ناہمواریوں سے پاک کر کے ہر جہت سے عدل و قسط پر استوار کرنا ہر طرح اہم تر اور مقدم تر ہے؛ تاکہ وہ محرومیاں اور ناداریاں وجود ہی میں نہ آئیں اور غربت و افلاس پیدا ہی نہ ہو جس کے لیے صدقہ و خیرات کی حاجت ہو؛ البتہ اس کے باوصف اگر کوئی کسی سبب سے معذور و لاچار ہو ہی جائے تو ضرورت ہے کہ اپنا نئے نوع کے قلوب ہمدردی اور انسان دوستی کے جذبہ سے اس درجہ سرشار ہوں کہ وہ اپنی محبوب ترین متاع کو اُن کے ازالے کے لیے صرف کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کریں! چنانچہ یہی ہے اسلام کا جامع ترین تصورِ خدمتِ خلق جس میں وہ عام تصورِ خدمتِ خلق بھی شامل ہے جو سب کو معلوم ہے اور مزید برآں وہ مزید دو سیمتیں بھی شامل ہیں جن میں سے ایک کا تعلق اسلام کے مخصوص نظامِ عقائد و ایمانیات سے ہے — اور دوسری کا انسان کے نظامِ اجتماعی سے! — اور ان تینوں کا کامل ظہور ہوا تاریخِ انسانی کے اُس دور میں جس کی یادوں و انسانی کی اجتماعی یادداشت (Collective Memory) میں بالکل اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کسی فرد کے دل و دماغ میں کسی حسین خواب کی یاد باقی رہ جاتی ہے

اور جسے دنیا ”خلافتِ راشدہ“ کے نام سے جانتی ہے، جس میں ایک جانب انسانی اخوت اور اس سے پیدا شدہ باہمی ہمدردی و مواساة انتہائی بلندیوں پر تھیں تو دوسری جانب حریتِ آخری ممکنہ حد کو پہنچی ہوئی تھی، اور تیسری جانب مساواتِ کامل ترین صورت میں جلوہ گر تھی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم:۔

كُلُّ مُؤْمِنٍ إِخْوَةٌ اِنْدَر دِلِّش
 حریتِ سرمایہ آب و گلش
 ناشکیبِ امتیازاتِ آمدہ!
 در نہادِ او مساواتِ آمدہ!

جس کی برکات کا ادنیٰ مظہر یہ ہے کہ لوگ خیرات و صدقات کا مال لیے پھرتے تھے اور انہیں قبول کرنے والا دستیاب نہ ہوتا تھا! فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ وَأَحْسَنُ الْحَاكِمِينَ!

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

(یہ مقالہ محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ نے لائسنز کلب گلبرگ لاہور کے اجلاس منعقدہ ۲۳ جنوری ۱۹۷۸ء میں پیش کیا۔)

اسلامی نظام عبادات میں اعتدال کی حکمتیں

مرتب: حافظ محبوب احمد خان

تاریخ مذاہب پر نظر رکھنے والوں کے لئے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ نیکی کا جذبہ انسان میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ہر مذہب اور ہر معاشرے میں نیکی کے مختلف تصورات ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ آسمانی مذاہب ہوں یا غیر آسمانی مذاہب؛ نیکی کے جذبے کے مختلف اظہار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسلام چونکہ ایک دین فطرت ہے لہذا اس نے اپنے نظام عبادات میں اہداف و مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ عبادات میں انسان اگر ان اہداف و مقاصد کو پیش نظر نہ رکھے تو غالب امکان ہے کہ اس کی عبادات کا رخ رُہبانیت کی جانب چلا جائے گا؛ جیسا کہ عیسائیت کی مذہبی تاریخ گواہ ہے۔ اور اگر عبادات کی روح انسان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو پھر معاملہ یہودیت سے جا ملے گا جہاں ظاہر پرستی نے اس قدر غلبہ پالیا تھا کہ عبادات کی روح غائب ہو گئی تھی۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں معاشرے اور افراد کی تباہی کی شکل میں سامنے آئے گا۔

اب اگر ہم یہ جائزہ لیں کہ اسلام کے نظام عبادات کا مقصد و ہدف کیا ہے تو نظر آتا ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کے لئے ایسا نظام عبادات تشکیل دیتا ہے کہ نہ صرف فرد کی انفرادی سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کا کام کرے بلکہ معاشرے کے لئے بھی اس کی شخصیت فائدہ مند ثابت ہو۔ تاریخ سے استشہاد قرآن کریم کا تیسرا بڑا موضوع ہے۔ انبیاء کی دعوت کے مدارج کا اگر جائزہ لیا جائے تو انسانی کردار کی تشکیل میں ایک بڑی پیاری ترتیب نظر آتی ہے۔ حضرت نوح، حضرت صالح اور حضرت ہود علیہم السلام نے عقائد کے ضمن میں انسانی افکار کی تطہیر کی؛ جبکہ حضرت لوط علیہ السلام نے انسانی زندگی کے معاشرتی پہلو میں توازن و اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انسانی زندگی کے معاشی پہلو کے حوالے سے اصلاح کی کوشش کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جدوجہد ایک پاکیزہ نظام

سیاست (غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار اور اللہ کی حاکمیت کا اثبات) کے لیے تھی، جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انسانی زندگی کو اخلاقی تعلیمات سے آراستہ کر کے انسانی شخصیت کی تکمیل کی۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات ہر اعتبار سے جامع ہیں۔ گویا عقائد، معاشرت، معیشت، سیاست اور اخلاقیات کی تعلیم سے آراستہ ہو کر ایک مکمل انسانی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآن کریم نے کئی مقامات پر بندہ مؤمن کی تصویر پیش کی ہے، جن میں اہم ترین مقام سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ ہے جسے آیت الہر کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (البقرۃ)

”نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو، بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور یومِ آخر پر، اور فرشتوں پر، اور کتابوں پر، اور انبیاء پر اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو، اور یتیموں کو، اور محتاجوں کو، اور مسافروں کو، اور سالکوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کر لیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں، تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعتاً راست باز ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً متقی ہیں۔“

نیکی کے جذبہ کے ضمن میں بھی اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ کسی وقت یہ ضرورت سے زیادہ مشتعل ہو کر حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور نتیجتاً نیکی سے بدی ظہور میں آجائے۔ مثلاً ایک شخص پر نیکی کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ وہ دنیا کو چھوڑ دے اور پہاڑوں کی کھوؤں اور غاروں میں جا کر دھوئی رمالے کہ بس رب سے لو لگانی ہے۔ رہبانیت کا نظام اسی نیکی کے جذبہ کے حدِ اعتدال سے تجاوز کی وجہ سے وجود میں آیا۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ

رویہ فطرت کے خلاف بغاوت ہے۔ فطرت انسانی میں جو ادعیات ہیں یہ ان سے دھینگا مشتق ہے۔ چنانچہ طبع بشری اور فطرت انسانی بسا اوقات انسان کو پچھاڑ دیتی ہے اور نتیجتاً اس کا ایک ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ عیسائی راہب خانوں میں اس ردِ عمل کے نتیجے میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

رہبانیت کی نئی ایک حدیث نبویؐ میں بڑی وضاحت سے وارد ہوئی ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ ہی کے دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تین اشخاص ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی نفلی عبادات کے بارے میں دریافت کیا کہ رات کو آپؐ کتنی نفلی نماز پڑھتے ہیں؟ مہینہ میں کتنے نفلی روزے رکھتے ہیں؟ حضور ﷺ کی حیات طیبہ ایک کھلی کتاب کی مانند تھی، اس میں تصنع کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ازواجِ مطہرات نے کسی بات میں مبالغہ نہیں کیا، جو صحیح بات تھی وہ بتا دی۔ ان صحابہؓ نے آپؐ کے اس معمول کو کم جانا، لیکن انہوں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ حضور ﷺ تو معصوم ہیں، آپؐ سے تو کسی خطا کا صدور ممکن ہی نہیں، آپؐ کو تو اتنی نفلی عبادات کی بھی ضرورت نہیں جتنی آپؐ کر رہے ہیں، یہ بھی آپؐ کے لیے بہت ہے، لیکن ہمارے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک نے کہا کہ میں تو پوری رات (نفلی) نمازوں میں گزاروں گا، کبھی نہیں سوؤں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا، کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں شادی اور گھر گریستی کا لکھنوی مول نہیں لوں گا، اس سے تو اللہ سے لو لگانے اور تعلق استوار کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، میں تو ساری عمر تہجد کی زندگی بسر کروں گا۔ حضور ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپؐ اپنی عادت شریفہ اور خلقِ کریم کے برعکس ناراض ہوئے۔ آپؐ نے ان تینوں کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ ”میں تم میں سے ہر ایک سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں، لیکن میں رات کو سوتا بھی ہوں اور (نفلی) نماز بھی ادا کرتا ہوں، میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں، میں نے شادیاں بھی کی ہیں اور میرے حوالہ عقد میں متعدد ازواج ہیں۔“ پھر آپؐ نے فرمایا: ((مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي)) ”(کان کھول کر سن لو! نیکی چاہے کتنے ہی خلوص کے تحت ہو، لیکن) جس کسی نے میری سنت اور میرے طریقے کو چھوڑ دیا (اور اس کے برعکس روش اختیار کی) تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں،“ پس اس طرح ہمارے لیے نیکی کے معیار کا مل ہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ ایک اسوہ حسنہ، ایک کامل نمونہ، ایک آئیڈیل ہمارے سامنے رہے جس میں نیکی کے تمام اعمال ایک توازن اور اعتدال میں سموائے ہوئے مل جائیں۔ اسی کو ہم کسوٹی سمجھیں، ہر عمل کے بارے میں اس کی طرف رجوع کریں کہ یہ عمل اس معیارِ کامل میں کتنا ہے اور دوسرے اعمال کے ساتھ اس کا تناسب کیا ہے.....! یہ اسوہ حسنہ و کاملہ وہ ہے جو ہمیں انبیاء و رسل کی زندگیوں میں ملتا ہے اور اس مقدس جماعت میں کامل ترین اور افضل ترین ہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ۔ یعنی تمام نیکیاں، تمام بھلائیاں، تمام خیرات و حسنات اگر ایک قحص واحد میں معتدل، متوازن اور جامعیت کے ساتھ دیکھنی ہوں تو اس کا نمونہ اور کسوٹی ہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔

اسلامی نظام عبادات میں اعتدال کی پہلی حکمت کے طور پر یہ جاننا چاہیے کہ اسلام میں عبادت کا مقصد نفس کشی نہیں، بلکہ ضبطِ نفس ہے۔ اگر نفس کو مجبور کر کے عبادت کا معاملہ کیا جائے گا تو خشوع و خضوع والی کیفیت ختم ہو جائے گی اور یہ عبادت محض ایک مشقت بن کر رہ جائے گی۔ ہر چیز کی ایک حرص ہوتی ہے اور ایک حد کے بعد اُس حرص میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ جن پر بیٹھے، ٹھائے ایک دم تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہے وہ عمل صالح میں اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ عبادات کا مقصد کھو بیٹھتے ہیں، وہ پھر رفتہ رفتہ اس عمل میں سستی اختیار کرنے لگ جاتے ہیں۔

عبادات میں حد و مقدار کی دوسری حکمت کو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک مریض کے مرض کے ازالے کے لیے دوا کی صرف ایک مقدار مقرر کی جاتی، جو اس کے مرض کا ازالہ کر دے اور اس میں کمی بیشی نہیں کی جاتی۔ اور یہ معاملہ مریض کی مرضی پر ہرگز نہیں چھوڑا جاتا، کیونکہ اگر یہ معاملہ اس کی مرضی و خوشی پر چھوڑ دیا جائے تو مریض اپنی طبیعت کے مطابق اس دوا میں کمی بیشی کر جائے گا، یعنی اگر دوا کڑوی ہوئی تو مریض اس میں لازماً کمی کر جائے گا، کیونکہ دوا کی کڑواہٹ کو انسانی طبیعت آسانی سے قبول نہیں کرتی، جبکہ اگر دوا میٹھی ہو تو انسانی طبیعت اس میں رغبت رکھتی ہے، تو ایسی صورت میں بھی مریض سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس مقدار اور حد کو قائم رکھ سکے گا۔

عبادات میں حد و مقدار مقرر کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان ایک معاشرے کا حصہ ہے۔ جس طرح اس پر عبادات کی ذمہ داری ہے اسی طرح اس پر معاشی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ بلکہ ایک جامع اصطلاح کے طور پر ”محقق العباد“ کو

پورا کرنا بھی اس پر لازم ہے۔ اسی طرح ایک صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ لہذا تیسری حکمت یہ ہے کہ انسان اپنی ان تمام ذمہ داریوں کو بھی عبادات کے ساتھ ساتھ ادا کر سکے۔ ان ذمہ داریوں کی تفصیل ایک حدیث مبارکہ میں ہے، جسے امام ترمذی نے کتاب الزہد میں اس طرح بیان کیا ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمان اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما کے مابین مواخات قائم کی۔ حضرت سلمانؓ حضرت ابو درداءؓ سے ملنے گئے تو انہوں نے (ان کی بیوی) اُم درداء کو پریشان دیکھا تو اُن سے ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا: ”تمہارے بھائی ابو درداء کو دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں (متاع دنیا کی کوئی ضرورت نہیں)۔ پھر جب حضرت ابو درداء آئے تو حضرت سلمانؓ نے ان کو کھانا پیش کیا، مگر انہوں نے کہا آپ کھائیے، میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمانؓ نے کہا میں بھی نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہ کھائیں، تو حضرت ابو درداءؓ نے کھانا کھا لیا۔ جب رات ہوئی تو حضرت ابو درداءؓ قیام کرنے چلے گئے (نوافل پڑھنے لگے)۔ حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا سو جائیے، تو وہ سو گئے۔ پھر حضرت ابو درداءؓ اٹھنے لگے تو سلمانؓ نے ان سے کہا سو جائیے تو وہ سو گئے۔ پس جب صبح کا وقت ہوا تو سلمانؓ نے ان سے کہا اب اٹھ جائیے۔ پس وہ دونوں اٹھے اور نماز ادا کی۔ حضرت سلمانؓ نے حضرت ابو درداءؓ سے فرمایا: ”یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے اور یقیناً تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ پس ہر حقدار کو اس کا حق ادا کیجئے“۔ پھر وہ دونوں حضور ﷺ کے پاس آئے اور یہ سارا ماجرا ذکر فرمایا تو حضور ﷺ نے حضرت ابو درداءؓ سے فرمایا: ”سلمان (رضی اللہ عنہ) نے سچ کہا۔“

چوتھی حکمت عبادات میں اعتدال کی یہ ہے کہ انسانی نفس کو راہ راست پر رکھا جائے اور اس کی کجی کو دور کیا جائے۔ انسان سے یہ مطلوب نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کی عبادات کو سرانجام دے۔ چونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اس لیے اس سے اس قسم کا مطالبہ دشوار بات معلوم ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک، جسے امام نسائی نے کتاب القبلۃ میں اس طرح بیان کیا:

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کی ایک چٹائی تھی، حضور ﷺ دن کے اوقات میں اسے پھیلا دیتے اور رات کے اوقات میں اس کو حجرہ بنا دیتے اور اس میں نماز ادا فرماتے۔ پس لوگوں نے سمجھا (کہ شاید آپ ساری رات قیام فرماتے

(ہیں) تو انہوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی جبکہ آپ اور ان لوگوں کے درمیان چٹائی تھی۔ پس آپ نے فرمایا: ”اتنا ہی عمل کرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا جب تک کہ تم خود کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ یقیناً اللہ کو سب سے زیادہ وہ عمل پسند ہے جس میں بھیگی ہو چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔“ پس آپ نے وہ جائے نماز چھوڑی آپ دوبارہ اس پر نہیں آئے یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے آپ کو اٹھالیا۔ اور آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ جو نیکی کا عمل بھی کرتے اس پر ثابت قدم رہتے۔“

انسانی وجود دو چیزوں سے مرکب ہے: روح اور مادی جسم۔ عبادات کا ایک مقصد یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کو کمزور کر دیا جائے اور روحانی تقاضوں کو بلند کر دیا جائے۔ اور جب انسان نیکی پر خوشی محسوس کرے اور گناہوں پر رنجیدہ ہو جائے تو سمجھ لے کہ یہ مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ اور اگر وہ عبادات میں کثرت کرے گا تو نفس اس کا عادی ہو جائے گا اور اس عبادت کے ثمرات اس کو حاصل نہیں ہو سکیں گے۔

پانچویں حکمت یہ ہے کہ انسان کی عبادات محض اس کے اپنے لیے نہیں ہیں بلکہ یہ آنے والی نسلوں کی تربیت کا سامان بھی ہے۔ اگر وہ عبادات میں تعق اختیار کر لے گا تو اس کے بعد جو لوگ اس سے سیکھنے والے یا اس کے پیروکار ہوں گے ان کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ شاید یہ عبادات عین تقاضائے اسلام ہیں اور ہم پر فرض ہیں۔ اور نسلوں کے تواتر سے یہ اعمال لوگوں کے لیے فرض کا درجہ اختیار کر جائیں گے اور نتیجہ یہ کہ جن اعمال کی فرضیت میں احتمال تھا اب ان کی فرضیت پر لوگوں کو اطمینان ہو جائے گا اور اس سے دین میں تحریف لازم آئے گی۔

اس ضمن میں ایک حدیث مبارکہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں اپنے سے نیچے والوں پر نگران ہیں۔ آپ کا ہر عمل ان کے لیے ایک نمونہ بنتا ہے۔ اور انسان کے لیے لازم ہے کہ انسانوں کے لیے ایسا نمونہ بنے جو ان کے لیے آسانی پیدا کرے نہ کہ ان کے لیے مزید مسائل کا پیش خیمہ بن جائے۔ ارشاد نبویؐ ہے:

عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ : ((أَلَا كُتِّبُ رَاعٍ وَكُتِّبُ مَسْئُولٌ عَنْ رِعِّيَّتِهِ ، فَلَا مِيرُؤَ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رِعِّيَّتِهِ ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ

وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ وَالْعَبْدُ رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُ ، أَلَا كَلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) (صحيح مسلم، كتاب الامارة)

”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اُس سے اُس کے ماتحتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ پس حاکم اپنے ماتحتوں کا ذمہ دار ہے اور اُس سے اُن کے متعلق پوچھا جائے گا، اور مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور اُس سے اُن کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی، اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی ذمہ دار ہے اور اُس سے اُن کے متعلق باز پرس کی جائے گی اور غلام اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اور اُس سے اُس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ خبردار رہیے! تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اُس کی ذمہ داری کے متعلق سوال کیا جائے گا۔“

قرآن کریم میں عدم توازن اور عدم اعتدال کی مثال تبعین عیسیٰ علیہ السلام سے دی گئی ہے:

﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَى آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَسُقُونَ ﴿۱۰۶﴾﴾ (الحديد)

”پھر ہم نے ان کے پیچھے انہی کی راہ پر اور رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا اور انہیں انجیل عطا فرمائی، اور ہم نے رکھ دی ان لوگوں کے دلوں میں جو عیسیٰ کے تابع فرمان تھے، شفقت اور رحمت۔ اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا، ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا، البتہ انہوں نے رضائے الہی کے حصول کے لیے اسے اختیار کیا تھا، پھر اسے وہ نباہ نہ سکے جیسے کہ اس کے نباہنے کا حق تھا۔ پس ہم نے عطا فرمایا جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے، ان (کے حسن عمل اور حسن نیت) کا اجر اور ان میں سے اکثر فاسق (و فاجر) تھے۔“

تبعین مسیح علیہ الصلاۃ والسلام میں اگر رہبانیت کا نظام آیا تو جہاں اس میں شیطان کے اغوا و اضلال کا معاملہ ہوا کہ اس نے انہیں جہاد و قتال، انقلاب اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد سے ہٹا کر اُن کی صلاحیتوں کو اُس رخ پر موڑ دیا وہاں اس کے لیے کچھ

اسباب بھی موجود تھے۔ لیکن حضور ﷺ کی اُمت میں اگر یہ معاملہ آیا ہے تو اس کی نسبت سینکڑوں درجے زیادہ قابلِ مذمت ہے، اس لیے کہ ان اسباب میں سے کوئی سبب یہاں موجود نہیں۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کا اُسوہ نہایت جامع اور نہایت متوازن ہے اور اس میں دین و دنیا کا مکمل اور خوبصورت امتزاج ہے۔ یہاں تک کہ تعددِ ازدواج اس ضمن میں سیرت کی سب سے نمایاں بات ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کڑوی گولی عیسائیوں کے حلق سے قطعاً نہیں اترتی، اس لیے کہ ان کا آئیڈیل حضراتِ مسیح اور یحییٰ علیہما السلام ہیں اور انہوں نے ایک ایک شادی بھی نہیں کی، جبکہ حضور اکرم ﷺ نے گیارہ شادیاں کیں اور کنیریں ان کے علاوہ تھیں۔ چنانچہ اس حوالے سے ان کے لیے تو کوئی نہ کوئی عذر موجود ہے، لیکن ہمارے ہاں اس کے باوجود اگر رہبانیت کا نظام آیا ہے تو یہ بہر حال زیادہ قابلِ مذمت ہے۔

عبادات میں حد سے زیادہ تعقُّق کے نتیجے میں سابقہ اُمتِ مسلمہ نہ صرف اپنی منزلِ مقصود سے ہٹ گئی بلکہ باوجود خلوص کے رب نے ان کی ان کاوشوں کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے جسے امام نسائی نے کتاب الایمان میں یوں نقل کیا ہے:

((إِنَّ هَذَا الدِّينَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا

وَأَبْشِرُوا وَيَسِّرُوا وَأَسْتَعِينُوا بِالْعَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَىءٍ مِّنَ الدَّلْجَةِ))

”بلاشبہ یہ دین آسان ہے۔ اور کوئی شخص دین میں سختی نہ کرے گا مگر دین اس کو پچھاڑ دے گا۔ پس میانہ روی اختیار کرو اور قریب ہو جاؤ (یہ خیال مت کرو کہ تم اس قدر خدا سے دور ہو کہ بغیر اعمالِ شاقہ کے اُس تک نہیں پہنچ سکتے)۔ امید اور سرورِ دل حاصل کرتے رہو، اور آسانی اختیار کرو، اور صبح و شام اور اخیر شب کے ایک حصہ سے مدد حاصل کرو (کہ ان اوقات میں رحمتِ الہی نازل ہوتی ہے اور دل نفسانی تذکروں سے خوب صاف ہوتا ہے)۔“

اس حدیث مبارکہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے افراد پر لازم ہے کہ وہ عبادات میں اعتدال پر مبنی رویہ اپنائیں اور اس میں اتنی زیادتی نہ کریں کہ جس کا بھانا مشکل ہو جائے، دینی امور مشتتبہ ہو جائیں اور دنیاوی امور کے منافع بے کار ہو جائیں۔ ان امور کو آنحضرت ﷺ نے اشارتاً اور بعض جگہ پر صراحتاً بھی بیان کیا ہے۔ صحیح البخاری، کتاب القبلۃ میں ارشادِ نبویؐ ہے:

((أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ))

”اللہ کو وہ اعمال زیادہ پسند ہیں جو ہمیشہ کیے جائیں، اگرچہ ان کی مقدار قلیل ہی کیوں نہ ہو۔“

ان اعمال کی پسندیدگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عبادات میں مداومت اور مستقل مزاجی دل کی خواہش اور رغبت کو ظاہر کرتی ہے۔ نیز عبادات کا اثر انسانی نفس جب ہی قبول کرتا ہے جب وہ اس کے فائدے سے مستفیض ہوتا ہے، یعنی وہ اپنے کردار و افکار میں مثبت تبدیلیاں محسوس کرتا ہے اور روحانی ترقی اس کو عبادات کے لیے فرصت اور تخلیہ فراہم کرتی رہتی ہے۔ صحیح بخاری، کتاب الوضوء میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلَّى وَهُوَ نَاعِسٌ لَا يَذَرِي أَوْ لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهُ))

”تم میں سے بعض لوگ سونے کی حالت میں نماز پڑھتے ہیں اور ان کو نہیں معلوم ہوتا کہ استغفار کے وقت اپنے نفس پر بددعا کرتے ہیں۔“

مراد یہ ہے کہ جس حالت میں طاعت و غیر طاعت میں تمیز نہ رہتی ہو اس عبادت سے نہ تو نفسانی تقاضے میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی روحانی ترقی وجود میں آئے گی۔ رات کے آخری حصہ میں انسان اگر تھوڑی سی عبادت کر لے تو وہ اس کے لیے انتہائی فائدہ مند اور رحمت الہی کا سبب بن سکتی ہے، کیونکہ اس وقت دل نفسانی تذکروں سے خالی اور صاف ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کے لیے تہجد کا تربیتی نظام اسی لیے رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس کو مسلمانوں پر فرض نہیں قرار دیا گیا مگر روحانی ترقی اور تعلق باری تعالیٰ کے ضمن میں یہ آزمودہ نسخہ ہے۔

اگر ہم اپنی عبادات میں وہ رویہ اپنائیں جو ہمیں سیرت نبویؐ اور تعامل صحابہؓ سے ملتا ہے تو یقینی بات ہے کہ اپنی زندگی کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور دیگر تمام شعبوں میں دینی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں گے۔ دنیا کو آج جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ زندگی کے یہی تین شعبے ہیں جہاں انسان افراط و تفریط کا شکار ہے۔ جب تک ہم مسلمان اپنی ان ذمہ داریوں کو ادا نہیں کریں گے اور عبادات کے اہداف و مقاصد کو سامنے نہیں رکھیں گے اس وقت تک نہ تو اللہ کی رحمتیں ہم پر برسیں گی اور نہ ہی ہماری یہ دعائیں رنگ لائیں گی جن میں ہم اللہ تعالیٰ سے ترقی و عروج کی التجا کرتے ہیں۔ ۵۰

ماخذ: (۱) حیحہ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ دہلوی (۲) درس آیۃ الہر اور سورۃ الحدید، ڈاکٹر اسرار احمد

اسلامی نظامِ زندگی

مسلمان کا طرزِ حیات (۴۴)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرہ آفاق کتاب
”منہاج المسلم“ کا اردو ترجمہ
مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب العبادات
آٹھواں باب

۸) اذان اور اقامت

۱) اذان:

۱) اذان کی تعریف: ”خاص الفاظ کے ساتھ نماز کا وقت شروع ہو جانے کی اطلاع دینا“۔

۲) اذان کا حکم: شہروں اور گاؤں والوں کے لیے اذان واجب کفایہ ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ وَلْيُؤَمِّكُمْ أَكْبَرُكُمْ))
”جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور تم میں زیادہ عمر والا نماز پڑھائے“۔

آبادی سے باہر رہنے والے اور مسافر کے لیے اذان کہنا مسنون ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافرين اذا كانوا جماعة والاقامة وكذلك۔ وصحیح مسلم، کتاب المساجد، باب من احق بالامامة۔

((فَإِذَا كُنْتَ فِي غَنَمِكَ أَوْ بَادِيَتِكَ فَادْنَتْ بِالصَّلَاةِ فَارْفَعْ صَوْتَكَ
بِالْبَدَاءِ فَإِنَّهُ لَا يَسْمَعُ مَدَى صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنَّ وَلَا إِنْسٌ وَلَا شَيْءٌ إِلَّا
شَهِدَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))^(۱)

”جب تو اپنی بکریوں میں ہو یا جب تو جنگل میں ہو اور نماز کے لیے اذان کہے تو بلند
آواز سے اذان کہہ۔ پس مؤذن کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے وہاں تک آواز سننے
والا ہر جن اور انسان بلکہ سب کچھ قیامت کے دن اُس کے حق میں گواہی دے گا۔“
۳) اذان کے الفاظ: جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو محمد زہریؓ کو جو اذان
سکھائی تھی اس کے الفاظ یہ ہیں:

اللَّهُ أَكْبَرُ، اللَّهُ أَكْبَرُ، اللَّهُ أَكْبَرُ، اللَّهُ أَكْبَرُ، اللَّهُ أَكْبَرُ
”اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے
بڑا ہے۔“

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؛ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا
کوئی معبود نہیں۔“

أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ
”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں؛ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد
(ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔“

اس کے بعد مؤذن دوبارہ بلند آواز سے شہادتین کے الفاظ دہرائے۔ اسے ترجیح کہتے ہیں۔
اس کے بعد کہے:

حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ
”نماز کی طرف آؤ! نماز کی طرف آؤ!“
حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ
”کامیابی کی طرف آؤ! کامیابی کی طرف آؤ!“

فجر کی اذان میں دوبارہ الفاظ بھی کہے:

الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ، الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب رفع الصوت بالنداء۔

واجب ہے اگرچہ وہ فوت شدہ نماز ہی ہو۔ فرمان نبوی ہے:

((مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ فِي قَرْيَةٍ وَلَا بَدْوٍ لَا تَقَامُ فِيهِمُ الصَّلَاةُ إِلَّا قَدْ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ، فَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذُّبُّ الْقَاصِيَةَ))^(۱)

”کسی بستی یا ڈیرے میں اگر تین آدمی ہوں اور ان میں نماز باجماعت قائم نہ کی جاتی ہو تو شیطان ان پر غلبہ پالیتا ہے۔ اس لیے جماعت کو اختیار کرو۔ بھڑیا اسی بکری کو کھاتا ہے جو (ریوڑ سے الگ ہو کر) ڈور چلی جاتی ہے۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا تھا کہ اذان کے کلمات دو دو بار اور اقامت کے کلمات ایک ایک بار کہیں۔“^(۲)

۲) اقامت کے الفاظ: حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جنہیں خواب میں اذان سکھائی گئی تھی۔ ان سے اقامت ان الفاظ میں مروی ہے:

اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ

”اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔“

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔“

أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ

”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔“

حَتَّى عَلَى الصَّلَاةِ

”نماز کی طرف آؤ۔“

حَتَّى عَلَى الْفَلَاحِ

”کامیابی کی طرف آؤ۔“

قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ

”نماز کھڑی ہوگئی، نماز کھڑی ہوگئی۔“

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب فی التشدید فی ترک الجماعة۔ و سنن النسائی، کتاب

الامامہ، باب التشدید فی ترک الجماعة۔ و مسند احمد۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب الامر بشفع الاذان و ایتار الاقامة۔ و صحیح البخاری،

کتاب الاذان، باب الاذان مثنی مثنی۔

اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ

”اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے“۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ^(۱)

”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں“۔

ایک مسئلہ: اقامت پر امام کا حق زیادہ ہے، یعنی مؤذن کو امام کے آجانے پر

اس کی اجازت سے اقامت کہنی چاہیے۔ حدیث میں ہے: ((الْمُؤَدِّنُ أَمْلَكُ بِالْأَذَانِ وَالْإِمَامُ أَمْلَكُ بِالْإِقَامَةِ))^(۲) ”اذان پر مؤذن کا زیادہ اختیار ہے اور اقامت پر امام کا اختیار زیادہ ہے“۔ اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے، اس لیے یہ حدیث ضعیف ہے۔ تاہم اکثر فقہاء کا عمل اس کے مطابق ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اسی مفہوم کی ایک حدیث حضرت علیؓ یا حضرت عمر فاروقؓ سے بھی مروی ہے۔ ان کے نزدیک اُس حدیث کی وجہ سے اِس حدیث کو بھی تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ البتہ اذان کے متعلق مؤذن زیادہ اختیار رکھتا ہے، لہذا وقت ہو جانے پر اُسے اذان کہہ دینی چاہیے، اسے امام یا کسی اور سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، نہ کسی کا انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔

اذان سے متعلق مندرجہ ذیل امور مستحب ہیں:

(۱) اذان کے الفاظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کیے جائیں اور اقامت کہنے میں تیزی ہو۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا تھا:

((إِذَا أَدَّيْتَ فَتَسَلَّ فِي أَذَانِكَ وَإِذَا أَقَمْتَ فَاحْذَرِ))^(۳)

”جب تو اذان کہے تو ٹھہر ٹھہر کر کہہ اور جب اقامت کہے تو جلدی جلدی کہہ“۔

(۲) جب اذان یا اقامت ہو رہی ہو تو سننے والا بھی اپنے منہ میں وہی الفاظ دہراتا

جائے جو اذان یا اقامت کہنے والا کہہ رہا ہو۔ البتہ ”حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ“ اور ”حَيَّ عَلَى

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب کیف الاذان۔

(۲) جامع الترمذی، ابواب الصلاة، باب ما جاء ان الامام احق بالاقامة۔ امام ترمذی نے یہ جملہ

حدیث کے طور پر ذکر نہیں کیا، بلکہ فرمایا ہے ”بعض علماء کا یہ قول ہے کہ مؤذن کا اذان کا زیادہ

اختیار رکھتا ہے اور امام اقامت کا زیادہ اختیار رکھتا ہے“۔

(۳) اس حدیث کو ابوالشیخ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن

ہے۔ جامع الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی الترسل فی الاذان۔

الْفَلَاحِ“ کے جواب میں کہے: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ (اللہ کی توفیق کے بغیر نہ برائی سے بچنے کی طاقت ہے نہ نیکی کرنے کی قوت)۔ اسی طرح ”قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ“ (نماز کھڑی ہوگئی) کے جواب میں کہے: أَقَامَهَا اللَّهُ وَأَدَامَهَا (اللہ تعالیٰ اسے قائم و دائم رکھے)۔ اس کی دلیل سنن ابی داؤد کی حدیث ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہی۔ جب انہوں نے قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ کہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَقَامَهَا اللَّهُ وَأَدَامَهَا))^(۱)

صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے۔ آپ نے فرمایا:

((إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ، ثُمَّ صَلُّوا عَلَيَّ، فَإِنَّهُ مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا، ثُمَّ سَلُوا اللَّهَ لِي الْوَسِيلَةَ فَإِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِي إِلَّا لِعَبْدٍ مِّنْ عِبَادِ اللَّهِ، وَأَرَجُو أَنْ أَكُونَ أَنَا هُوَ، فَمَنْ سَأَلَ لِي الْوَسِيلَةَ حَلَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ))^(۲)

”جب تم مؤذن (کی اذان) کو سنو تو خود بھی اسی طرح کہو جس طرح مؤذن کہتا ہے۔ پھر مجھ پر درود پڑھو۔ پس جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتے ہیں۔ پھر میرے لیے اللہ سے ”وسیلہ“ کی دعا کرو۔ وہ جنت کا ایک درجہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک ہی بندے کے لائق ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا۔ پس جو شخص اللہ سے میرے لیے ”وسیلہ“ کی

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب ما يقول اذا سمع الاقامة۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن سمعه ثم يصلى على النبي صلی اللہ علیہ وسلم ثم يسأل الله له الوسيلة۔ اذان سن کروسیلہ مانگنے کا طریقہ: صحیح بخاری میں مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص اذان سن کر یہ دعا پڑھے قیامت کے دن اس کے لئے میری شفاعت حلال ہو جائے گی: اَللّٰهُمَّ رَبِّ هَذِهِ الدَّعْوَةُ التَّامَّةُ وَالصَّلَاةُ الْقَائِمَةُ اَبْتُ مُحَمَّدًا الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَاَبْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا الَّذِي وَعَدْتَهُ“ اے اللہ! اے اس کمل بلاوے اور قائم رہنے والی نماز کے مالک! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور آپ کو اُس مقام محمود پر فائز کر جس کا تو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمایا ہے۔ (صحیح البخاری، کتاب

الاذان، باب ما يقول اذا سمع المنادى)

نوٹ: ”مقام محمود“ سے وہ مقام مراد ہے جہاں حضور علیہ السلام قیامت کے دن ”شفاعتِ کبریٰ“ فرمائیں گے اور ”وسیلہ“ جنت کا اعلیٰ ترین مقام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے افضل ترین بندے کے لیے خاص کیا ہے۔

دعا کرے گا اس کو میری شفاعت نصیب ہوگی۔“
 (۳) اذان کے بعد بھلائی کی دعا مانگنا۔ امام ترمذی نے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد
 روایت کیا ہے کہ:

((اللُّدْعَاءُ لَا يُرَدُّ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ))^(۱)

”اذان اور اقامت کے درمیان دعا رد نہیں ہوتی۔“

مغرب کی اذان کے وقت یہ دعا بھی حدیث نبویؐ میں مذکور ہے:

((اللَّهُمَّ إِنَّ هَذَا إِقْبَالُ لَيْلِكَ وَإِدْبَارُ نَهَارِكَ وَأَصْوَاتُ دُعَاتِكَ
 فَاغْفِرْ لِي))^(۲)

”اے اللہ! یہ تیری رات کے آنے اور دن کے جانے کا، اور تیری طرف پکارنے
 والوں کی آوازوں کا وقت ہے، پس تو مجھے بخش دے۔“

۹) مسافر کی نماز، دو نمازیں ملا کر پڑھنا، مریض کی نماز اور حالتِ خوف کی نماز کے مسائل

۱) مسافر کی نمازِ قصر:

۱) قصر کا مفہوم: قصر کا مطلب یہ ہے کہ مسافر چار رکعت والی نماز کے بجائے دو
 رکعت ادا کرے۔ ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھے۔ مغرب اور فجر کی
 نماز قصر نہیں کی جاتی۔ مغرب کی تین ہی رکعتیں ادا کی جاتی ہیں اور فجر کی حسب معمول دو
 رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔

۲) قصر کا حکم: نماز میں قصر قرآن مجید سے بھی ثابت ہے اور حدیث نبویؐ سے بھی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنْ

(۱) جامع الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء في ان الدعاء لا يرد بين الاذان والاقامة۔ امام

ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب ما يقول عند اذان المغرب۔ وجامع الترمذی، کتاب

الدعوات، باب دعاء أم سلمة۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

الصَّلَاةُ ﴿النساء: ۱۰۱﴾

”جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز قصر کرو۔“
جناب رسول اللہ ﷺ سے نماز قصر کے متعلق سوال کیا گیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((صَدَقَةَ تَصَدَّقَ اللَّهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَأَقْبِلُوا صَدَقَتَهُ))^(۱)

”یہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا ہے، تو اللہ کا صدقہ قبول کرو۔“
چونکہ آنحضرت ﷺ نے قصر پر مدامت فرمائی ہے لہذا اسے سنت مؤکدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جو سفر بھی کیا اُس میں خود بھی اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی نماز قصر ہی ادا فرمائی۔

۳) قصر کی مسافت: جناب رسول اللہ ﷺ نے قصر کے لیے کسی خاص مسافت کا تعین نہیں فرمایا۔ صحابہ کرام تابعین عظام اور ائمہ اسلام نے جناب رسول اللہ ﷺ کے مختلف سفر دیکھ کر آراء قائم کی ہیں۔ اکثر علماء نے چار برد یعنی اڑتالیس عربی میل وہ کم از کم مسافت قرار دی ہے جس کے سفر سے قصر کرنا مسنون ہے۔ چنانچہ جو شخص اتنے فاصلے کا سفر کرے اور اس کا سفر کسی گناہ اور محصیت کے لیے نہ ہو، اس کے لیے سنت یہ ہے کہ ظہر، عصر اور عشاء میں چار رکعت کے بجائے دو رکعت فرض ادا کرے۔

۴) قصر کی ابتدا اور انتہا: مسافر جب اپنے شہر کے مکانات سے آگے نکل جائے تو قصر نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور وہ اُس وقت تک قصر کرتا رہے گا جب تک اپنے شہر میں واپس نہیں آ جاتا۔ ہاں اگر وہ کسی مقام پر چار دن یا زیادہ ٹھہرنے کی نیت کر لے تو وہاں اسے پوری نماز پڑھنی چاہیے، قصر نہ کرے۔[☆] اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مسافر اقامت کی نیت کر لیتا ہے تو اسے دلی سکون اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے، اس طرح وہ سب ختم ہو جاتا ہے جس کی بنا پر قصر کا حکم دیا گیا تھا اور وہ سبب ہے سفر کے معاملات میں دل کا مشغول رہنا اور سفر کی پریشانی۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے تبوک کے مقام پر بیس دن قیام فرمایا تھا اور نماز قصر کرتے رہے تھے۔^(۲) اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے وہاں مقیم ہونے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا۔

(۱) صحیح البخاری۔ وصحیح مسلم؛ کتاب صلاة المسافرين وقصرها؛ باب صلاة المسافرين وقصرها۔

☆ واضح رہے کہ احناف کے ہاں پندرہ دن یا اس سے زیادہ قیام کی نیت پر نماز پوری پڑھنی ہوگی۔

(۵) سفر میں نفل نماز: سفر کے دوران سنت مؤکدہ اور دیگر تمام نوافل چھوڑے جاسکتے ہیں۔ البتہ فجر کی سنتیں اور وتر کی نماز ترک کرنا بہتر نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: ”اگر مجھے سنتیں پڑھنا ہوتیں تو میں فرض نماز ہی پوری پڑھ لیتا۔“ (۱)

اسی طرح مسافر کے لیے جس قدر چاہے، نوافل پڑھنا بلا کراہت جائز ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کے دوران نمازِ صحیٰ کی آٹھ رکعتیں پڑھی تھیں۔ (۲) اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کے دوران راستے میں سواری کی پشت پر نفل پڑھ لیا کرتے تھے۔ (۳)

(۶) قصر کرنا ہر مسافر کے لیے مسنون ہے: قصر کے مسئلہ میں پیدل سفر کرنے والے اور سواری پر راستہ طے کرنے والے مسافر کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح اونٹ پر سوار ہو کر سفر کرنے والا اور کاریا ہوئی جہاز سے سفر کرنے والا برابر ہیں۔ البتہ بحری جہاز پر سفر کرنے والا ملاح جو ہمیشہ جہاز ہی پر رہتا ہو اور جہاز پر ہی اس کے اہل و عیال موجود ہوں اس کے لیے وہ جہاز گھر کے حکم میں ہے لہذا اس کے لیے قصر کرنا مسنون نہیں، بلکہ اسے پوری نماز ادا کرنی چاہیے۔

ب) جمع بین الصلاّاتین (دونمازیں ملا کر پڑھنا):

(۱) نمازیں جمع کرنے کا حکم: دونمازیں ایک وقت میں پڑھنا ایک جائز رخصت ہے؛ البتہ عرفہ کے دن عرفات کے میدان میں ظہر اور عصر کو اکٹھا پڑھنا اور مزدلفہ کی شب مغرب اور عشاء کی نمازیں مزدلفہ میں ملا کر پڑھنا لازمی سنت ہے، جسے چھوڑنا جائز نہیں۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ عرفات میں ظہر اور عصر کی نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا فرمائیں، اس کے بعد جب مزدلفہ پہنچے تو وہاں مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا فرمائیں۔ (۴)

(۲) اس کا طریقہ: نمازیں جمع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسافر جمع تقدیم کے طریقے

(۱) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة المسافرين وقصرها۔

(۲) فتح مکہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت أم ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر میں صحیٰ کے وقت آٹھ رکعت نماز ادا کی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ مکہ میں آپ مسافر تھے۔ دیکھیے صحیح مسلم، کتاب

صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة الضحیٰ..... الخ۔

(۳) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب جواز صلاة النافلة علی الدابة فی السفر حیث توجهت۔

(۴) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

سے ظہر اور عصر کی دونوں نمازیں ظہر کے اوّل وقت میں پڑھ لے یا ظہر اور عصر دونوں کو عصر کے اوّل وقت میں جمع تاخیر کے طریقے پر ادا کر لے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کو جمع تقدیم کے طور پر مغرب کے وقت یا جمع تاخیر کے طور پر عشاء کے وقت پڑھ لے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تبوک میں ایک دن نماز میں تاخیر فرمائی، پھر (خیمہ سے) باہر تشریف لائے اور ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی ادا فرمائیں۔ اس کے بعد باہر تشریف لائے تو مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی ادا فرمائیں۔ یہ اُس وقت ہوا جب آپ ﷺ جہاد کے لیے تبوک کے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے۔^(۱)

اسی طرح بستی میں رہنے والوں کے لیے بھی جائز ہے کہ جب رات کے وقت بارش یا سخت سردی یا تیز آندھی کا عذر ہو اور عشاء کی نماز کے لیے دوبارہ مسجد میں آنا دشوار ہو تو مسجد میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی بارش والی رات میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے ادا کی تھیں۔^(۲)

اگر مریض کو ہر نماز اپنے اپنے وقت پر ادا کرنے میں مشقت ہو تو وہ بھی ظہر اور عصر کو ملا سکتا ہے اور مغرب اور عشاء کو ملا کر پڑھ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمع کی علت مشقت ہے، جب بھی مشقت پائی جائے گی نمازیں جمع کرنا جائز ہوگا۔ بعض اوقات سفر کے بغیر بھی مسلمان کو ایسی سخت حاجت پیش آسکتی ہے، مثلاً جان مال یا عزت کا خوف، جس کی وجہ سے اُس کے لیے نمازیں جمع کر کے ادا کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک بار بغیر سفر کے اور بغیر بارش کے نمازیں ملا کر پڑھی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِالْمَدِينَةِ سَبْعًا وَتَمَانِيًا، الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ^(۳)
 ”نبی ﷺ نے مدینہ میں سات رکعتیں اکٹھی اور آٹھ رکعتیں اکٹھی پڑھیں، یعنی ظہر

اور عصر اور مغرب اور عشاء۔“

اس کا طریقہ یہ ہے کہ ظہر کی نماز کو مؤخر کرے اور عصر کو جلدی اس کے اوّل وقت میں ادا کر لے۔ اسی طرح مغرب کو مؤخر کرے اور عشاء میں جلدی کر کے اوّل وقت میں ادا کر لے۔

(۱) متفق علیہ۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب المواقیب، باب تأخیر الظہر الی العصر۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب المواقیب، باب تأخیر الظہر الی العصر۔ و صحیح مسلم، کتاب

صلاة المسافرين وقصرها، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دودو نمازوں کے اوقات میں اشتراک ہے۔

(ج) بیمار کی نماز:

اگر مریض سہارا لے کر بھی کھڑا نہ ہو سکتا ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھے، اگر بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھے، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو چت لیٹ کر قبلہ کی طرف پاؤں پھیلا کر نماز پڑھے۔ سجدے کے لیے رکوع سے زیادہ جھکے۔ اگر رکوع اور سجدہ کی طاقت نہ ہو تو اشارے کرے، لیکن نماز کسی حال میں بھی ترک نہ کرے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”مجھے پھوڑے نکلے ہوئے تھے۔ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے متعلق دریافت کیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ))^(۱)
 ”کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر (کھڑے ہو کر) نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر (پڑھو)۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل (لیٹ کر) نماز پڑھو۔“

(د) نمازِ خوف:

(۱) مشروعیت: نمازِ خوف کے شروع ہونے کی دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:
 ﴿وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ
 وَلْيَأْخُذُوا آسَلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ
 طَائِفَةٌ أُخْرَى لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ
 وَأَسْلِحَتَهُمْ﴾ (النساء: ۱۰۲)

”جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہوں اور ان کے لیے نماز قائم کریں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ لوگ اپنے ہتھیار لے لیں۔ پس جب وہ سجدہ کر لیں تو وہ آپ کے پیچھے سے ہٹ جائیں اور دوسری جماعت (کے افراد) آجائیں جنہوں نے نماز نہیں پڑھی، تو وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ اپنا بچاؤ اور اپنا اسلحہ لے لیں۔“

(۲) سفر میں نمازِ خوف کا طریقہ: احادیث میں نمازِ خوف کے کئی طریقے بیان ہوئے ہیں۔ ان کا انحصار خوف کی شدت اور عدم شدت پر ہے۔ اگر مجاہدین وطن سے دور

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب اذا لم يطق قاعدا فعلى جنب۔

ہوں اور نماز خوف کا وقت آ جائے تو اس کا زیادہ مشہور طریقہ یہ ہے کہ لشکر کے دو حصے ہو جائیں، ایک گروہ دشمن کے سامنے دفاع کے لیے کھڑا رہے اور ایک گروہ امام کے پیچھے نماز کے لیے صف بنا لے۔ امام انہیں ایک رکعت پڑھائے۔ اس کے بعد امام کھڑا رہے اور اس گروہ کے افراد اپنی اپنی ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ وہ جا کر دشمن کے مقابلے میں مشغول ہو جائیں اور دوسرا گروہ آ کر امام کے پیچھے کھڑا ہو جائے۔ امام انہیں بھی ایک رکعت پڑھائے۔ اس کے بعد امام بیٹھا رہے اور وہ افراد اٹھ کر دوسری رکعت اپنی اپنی پڑھ لیں۔ پھر امام اور یہ دوسرا گروہ اکٹھے سلام پھیریں۔

نماز خوف کے اس طریقہ کا ذکر حضرت قتیبہ بن سعید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ حدیث

کے الفاظ یوں ہیں:

أَنَّ طَائِفَةً صَفَّتْ مَعَهُ وَطَائِفَةٌ وَجَّاهَ الْعَدُوَّ ، فَصَلَّى بِالَّتِي مَعَهُ رَكْعَةً ، ثُمَّ تَبَّتْ قَائِمًا ، وَاتَّمُوا لِأَنْفُسِهِمْ ، ثُمَّ انْصَرَفُوا فَصَفُّوا وَجَّاهَ الْعَدُوَّ ، وَجَاءَتِ الطَّائِفَةُ الْأُخْرَى فَصَلَّى بِهِمُ الرُّكْعَةَ الَّتِي بَقِيَتْ مِنْ صَلَاتِهِ ، ثُمَّ تَبَّتْ جَالِسًا وَاتَّمُوا لِأَنْفُسِهِمْ ، ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ ^(۱)

”ایک گروہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صف باندھ لی اور ایک گروہ دشمن کے مقابل رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گروہ کو ایک رکعت پڑھائی جو آپ کے ساتھ تھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے رہے اور ان لوگوں نے خود ایک رکعت پوری کر لی اور چلے گئے اور دشمن کے مقابل صفیں باندھ لیں اور دوسرا گروہ آ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے ساتھ اپنی باقی ماندہ رکعت پڑھائی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے رہے اور ان (صحابہ) نے خود نماز مکمل کر لی اور پھر آپ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔“

(۳) حضر میں نماز خوف: اگر جنگ کے دوران مجاہدین اپنے گھر سے اتنی دور نہ ہوں جتنے فاصلے پر نماز قصر ادا کی جاتی ہے تو پہلا گروہ امام کے ساتھ دو رکعتیں پڑھے اور دو رکعتیں اپنی اپنی پڑھ لیں۔ اس دوران امام کھڑا رہے۔ پھر دوسرا گروہ آ جائے۔ امام انہیں بھی دو رکعتیں پڑھائے اور بیٹھا رہے اور مقتدی دو دو رکعتیں خود پڑھ لیں، پھر امام ان کے ساتھ سلام پھیرے۔

(۴) اگر جنگ کی شدت کی وجہ سے فوج کے دو حصے نہ کیے جا سکیں: اگر جنگ

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة ذات الرقاع۔ وصحیح مسلم، کتاب صلاة

المسافرین وقصرها، باب صلاة الخوف۔

شدید ہو جائے اور معروف طریقے سے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے نماز خوف ادا نہ کی جا سکے تو ہر مجاہد بغیر جماعت کے انفرادی طور پر نماز ادا کر لے، خواہ نماز کے دوران سوار ہو یا پیدل چل رہا ہو، خواہ قبلہ کی طرف منہ ہو یا نہ ہو، جس طرح ہو سکے اشارے سے نماز پڑھ لی جائے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فِرْجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾ (البقرة: ۲۳۹)

”پس اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل یا سواری پر (نماز پڑھ لو)۔“

حدیث نبویؐ ہے:

((وَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ فَلْيُصَلُّوا قِيَامًا وَرُكْبَانًا))^(۱)

”اگر وہ اس سے بھی زیادہ (خطرہ کی حالت میں) ہوں تو کھڑے کھڑے یا سواریوں پر نماز پڑھ لیں۔“

اس حدیث میں جو ”أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ“ کے الفاظ ہیں، اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جب خوف کی شدت ہو اور معرکہ برپا ہو اور مجاہدین دشمنوں کے ساتھ گھمسان کی جنگ لڑ رہے ہوں۔

(۵) دشمن کے تعاقب میں یا دشمن سے خائف: جو شخص دشمن کے تعاقب میں ہو اور اسے خطرہ ہو کہ نماز میں مشغول ہونے کی وجہ سے دشمن بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا یا جس کے پیچھے دشمن لگا ہوا ہو اور اُسے خطرہ ہو کہ نماز کے لیے رکنے کی صورت میں دشمن اسے پکڑ لے گا، وہ جس حالت میں بھی ہو نماز پڑھ لے، خواہ چل رہا ہو یا بھاگ رہا ہو، خواہ اس کا منہ قبلہ کی طرف ہو یا کسی اور طرف ہو۔ قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فِرْجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾ ”پس اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل یا سواری پر (نماز پڑھ لو)۔“ حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہڈی کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ وہ فرماتے ہیں: ”جب مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ میرے اور اس کے درمیان (تعاقب کا) سلسلہ طویل ہو جائے گا جس سے نماز میں تاخیر ہو جائے گی تو میں چلتے چلتے نماز پڑھنے لگا، اس کی طرف منہ کیے ہوئے ہی (رکوع اور سجدہ) اشارے سے ادا کرتا رہا، یہاں تک کہ میں اس کے قریب پہنچ گیا.....“^(۲)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب صلاة الخوف رجالاً وركباناً راجل قائم۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، ابواب صلاة الخوف، باب صلاة الطالب۔

گوشہ خواتین

عیسائیت اور اسلام میں عورت کے مقام کا تقابل

تحریر: ڈاکٹر طاہرہ ارشد

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جو قوم عروج پر ہوتی کے لحاظ سے تمام اقوام اُس کی پیروی کرنے لگتی ہیں۔ آج جس قدر تیزی سے مشرق کی عورت مغربی تہذیب کو اپنا رہی ہے وہ ناقابلِ فہم ہے۔ مغربی تہذیب کسی بھی لحاظ سے (ماسوائے ٹیکنالوجی) عروج پر نہیں، بلکہ اُن کا معاشرتی نظام تو بری طرح زوال پذیر ہے۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مشرق کی عورت اپنی لاعلمی کی وجہ سے مغرب زدہ بننے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ کیوں نہ ہم اس لاعلمی بلکہ جہالت کو دُور کرنے کی کوشش کریں! ذرا عورت کے اصل مقام کے بارے میں عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات کا موازنہ کیجیے!

انجیل متی باب ۱۹ آیت ۹ میں لکھا ہے:

”اور میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی چھوڑی ہوئی سے بیاہ کر لے وہ بھی زنا کرتا ہے۔“

جبکہ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلِّغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ
أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَلِكَ يُوعِظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَلِكَمْ أَزْكَى لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا
تَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾﴾

”اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر لیں اپنی عدت، تو انہیں نکاحِ ثانی کرنے سے مت روکو جب وہ راضی ہوں آپس میں دستور کے مطابق۔ یہ اُس کو

نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ یہی تمہارے لیے زیادہ ستر اور پاکیزہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔“

انجیل متی باب ۱۹، آیت ۱۲ کے الفاظ ہیں:

”کیونکہ بعض خوبے ایسے ہیں جو ماں کے پیٹ ہی سے ایسے پیدا ہوئے اور بعض خوبے ایسے ہیں جن کو آدمیوں نے خوبہ بنایا اور بعض خوبے ایسے ہیں جنہوں نے آسمان کی بادشاہی کے لیے اپنے آپ کو خوبہ بنایا۔ جو قبول کر سکتا ہے وہ قبول کر لے۔“

یعنی آسمانی بادشاہت میں داخلہ کے خواہش مند تہی کا میاب ہو سکتے ہیں جب وہ عورت سے تعلق نہ رکھیں۔ آئیے دیکھیں قرآن مجید کیا کہتا ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ

بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْتَقِرُونَ﴾ (الروم)

”اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے پیدا کیے تمہاری جنس سے جوڑے (یعنی میاں بیوی) تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور مہربانی پیدا کی۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔“

عورت کے مقام کو اور زیادہ اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے ہم انجیل کی آیات کا جواب

احادیث کے ذریعے دیتے ہیں۔ پہلے انجیل کی آیات ملاحظہ فرمائیں!

۱۔ کرنتھیوں، باب ۷:

(۱) ”مرد کے لیے اچھا ہے کہ عورت کو نہ چھوئے۔“ (آیت ۲)

(۲) ”اگر تیرے بیوی ہے تو اُس سے جدا ہونے کی کوشش نہ کرو اور اگر تیرے بیوی نہیں تو بیوی کی تلاش نہ کرو۔ لیکن تو بیاہ کرے بھی تو گناہ نہیں اور اگر کنواری بیاہی جائے تو گناہ نہیں مگر ایسے لوگ جسمانی تکلیف پائیں گے اور میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں۔“ (آیات ۲۷، ۲۸)

(۳) ”پس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم بے فکر رہو بے بیاہ شخص خداوند کی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح خداوند کو راضی کرے۔ مگر بیاہ ہوا شخص دنیا کی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح اپنی بیوی کو راضی کرے۔ بیاہی اور بے بیاہی میں بھی فرق ہے۔ بے بیاہی خداوند کی فکر میں رہتی ہے تاکہ اس کا جسم اور روح دونوں پاک ہوں۔ مگر بیاہی ہوئی عورت دنیا کی فکر میں رہتی ہے کہ کس طرح اپنے شوہر کو راضی کرے۔“ (آیات ۳۲ تا ۳۴)

(۴) ”..... اور دل میں قصد کر لیا ہو کہ میں اپنی لڑکی کو بے نکاح رکھوں گا وہ اچھا کرتا

ہے۔ پس جو اپنی کنواری لڑکی کو بیاہ دیتا ہے وہ اچھا کرتا ہے اور جو نہیں بیاہ دیتا وہ اور

بھی اچھا کرتا ہے“۔ (آیات ۳۷ و ۳۸)

یہ تو تھیں انجیل کی تعلیمات جن کے مطابق عورت سے پرہیز ہی بہتر نظر آتا ہے۔ آئیے

چند احادیثِ نبویہ کا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی نظر میں

عورت کس مقام پر فائز ہے!

(۱) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہم سے فرمایا: ”اے جوان لوگو! تم

میں سے جو استطاعت رکھے وہ نکاح کرے اس لیے کہ نکاح آنکھوں کو نچا کرتا ہے اور شرم

گاہ کو (زنا سے) بچاتا ہے۔ اور جو شخص خرچ کی طاقت نہ رکھے وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ

اُس کی خواہش نفس کو ختم کر دے گا“۔ (صحیح مسلم، کتاب النکاح)

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”(میرے دل میں)

عورت اور خوشبو کی محبت ڈال دی گئی ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے“۔ (سنن نسائی)

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب کوئی شخص نکاح

کر لیتا ہے تو وہ اپنا آدھا دین مکمل کر لیتا ہے لہذا اسے چاہیے کہ باقی آدھے دین کے

معاملے میں اللہ سے ڈرتا رہے“۔ (بیہقی)

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تین

آدمیوں کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے: (i) وہ غلام جس نے اپنے مالک سے آزادی کے

لیے معاہدہ کیا اور وہ ادائیگی کی نیت رکھتا ہے۔ (ii) برائی سے بچنے کی نیت سے نکاح کرنے

والا۔ (iii) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا“۔ (سنن نسائی)

یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ قرآن مجید تحریف شدہ آسمانی کتابوں کی تصحیح کرتا ہے۔

اب ہم کچھ مثالوں کے ذریعے دیکھتے ہیں کہ انجیل کی بات کس حد تک درست ہے۔

گلتیوں، باب ۵، آیت ۲۴ میں ہے:

”اور جو مسیح یسوع کے ہیں انہوں نے جسم کو اُس کی رعبتوں اور خواہشوں سمیت

صلیب پر کھینچ دیا ہے“۔

اس بات پر قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِوَسْلَانَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ ۗ

وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَافِقَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَةً ۖ اِبْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اِلَّا اِبْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۗ فَآتَيْنَا الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۖ وَكَثِيْرًا مِنْهُمْ فَنَسَقُوْنَ ﴿٦٠﴾ (الحديد)

”پھر ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے اور (اُن سب کے بعد) عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا اور ہم نے اسے دی انجیل اور جن لوگوں نے اُس کی پیروی کی اُن کے دلوں میں ہم نے نرمی اور محبت ڈال دی اور ترک دنیا (کی رسم) خود انہوں نے ایجاد کر لی، ہم نے اُن پر یہ واجب نہ کی تھی، مگر (انہوں نے) اللہ کی رضا چاہنے کے لیے (اختیاری) تو اُس کو نہ باہ سکے جیسے اس کے ناپسند کا حق تھا، تو اُن میں سے جو لوگ ایمان لائے، ہم نے ان کو اُن کا اجر دیا اور اکثر اُن میں سے نافرمان ہیں۔“

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آدم وحواء علیہم السلام کے جنت سے نکالے جانے کے بارے میں انجیل کیا کہتی ہے:

☆ پیدائش باب ۳ آیت ۶:

”عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا اور آکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوب ہے تو اُس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اُس نے کھایا۔“

یعنی سارا الزام عورت حوا یعنی ”Eve“ پر ہے۔ اسی سے انہوں نے لفظ ”evil“ نکالا ہے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اس موضوع پر تثنیہ کے صیغہ میں بات کرتا ہے۔ عربی کی ادنیٰ سی ہُد ہد رکھنے والا شخص جانتا ہے کہ ”هُمَا“ کا صیغہ ”دونوں“ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ارشادِ بانی ہے:

﴿وَيَاٰدُمْ اَسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظَّالِمِيْنَ ﴿٦١﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وَّرٰى عَنْهُمَا مِنْ سَوَاتِيْهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَا مَلَكِيْنَ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٦٢﴾ وَقَاَسَمَهُمَا اِنِّيْ لَكُمْ اِلٰمِنَ النَّصِيْحِيْنَ ﴿٦٣﴾ فَذَلَّهُمَا بِغُرُوْرٍ ۗ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوَاتِيْهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۗ وَنَادٰهُمَا رَبُّهُمَا اَلَمْ اَنْهٰكُمَا عَنْ تِلْكَ الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ اَعْدُوْ

”اور اے آدم! تو اور تیری بیوی دونوں اس جنت میں رہو جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس نہ پھلنا، ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے اُن (دونوں) کو بہکا یا تا کہ ان کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں، اُن کے سامنے کھول دے۔ اس نے اُن سے کہا: تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں بھنگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے، اور اس نے قسم کھا کر اُن سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب اُن دونوں نے اُس درخت کا مزا چکھا تو اُن کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھاکنے لگے۔ تب ان کے رب نے انہیں پکارا ”کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟“

قرآن مجید میں یہی مضمون دیگر مقامات پر بھی مشنیہ کے صیغے میں ہی بیان ہوا ہے۔ انجیل (محرّف) میں عورت کے آدم ﷺ کو جنت سے نکلوانے کی پاداش میں خدا کی طرف سے جو سزا تجویز کی گئی وہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

پیدا آتش، باب ۳، آیت ۱۶:

”پھر اُس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے درجمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔“

جبکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے بعد ماں باپ کا شکر ادا کرنے کا ذکر کر رہے ہیں اور ماں کی تکلیف کا خاص طور سے ذکر ہوا ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصْلَهُ فِي

عَامِينَ أَنْ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ﴾ ﴿٣١﴾ (لقمن)

”اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اُس کے ماں باپ کے بارے میں (حسن سلوک کی)۔ اُس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری جمیل کر اُسے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اُس کا دودھ چھڑایا کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔“

عیسائی آدم و حوا ﷺ کے جنت سے نکلے جانے کو "The Original Sin" نام دیتے ہیں اور عورت ہی کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اُن کے عقیدے کے مطابق اس کے نتیجے میں نیکی کی قوت سلب کر لی گئی، خدا نے اپنی رحمت انسان سے اٹھالی اور انسان اس ایک گناہ کے ذریعے بے شمار گناہوں میں مبتلا ہو گیا۔ چونکہ اُن کی نظر میں عورت اس سارے عمل کی ذمہ دار تھی اس لیے عورت سے نفرت، بغض اور تعصب بھی دیگر گناہوں کے ساتھ ساتھ عیسائی مردوں کی فطرت میں شامل ہو گیا۔ نہ تو اُن کی فطرت یہ ماننے کو تیار تھی کہ وہ ازلی گناہ گار ہیں اور نہ ہی عورت جسے "Eve" کا خطاب دیا گیا، اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار تھی کہ وہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ نتیجتاً ان لوگوں نے جو خود کو عیسائی کہتے تھے اپنے مذہب کی تعلیمات سے انحراف کیا اور عورت بھی اُس مذہب سے آزاد ہوتے ہوتے مادر پدر آزاد ہو گئی۔ اہل مغرب کی مصوری، مجسمہ سازی اور اُن کے ادب کا اگر آپ مطالعہ کریں تو عورت کے لیے گالیوں اور فحش کلمات کی بہتات ملے گی، جبکہ مسلم ادیبوں نے کائنات کے حسن میں عورت کے وجود کو لازم قرار دیا اور اُس کے لیے خوبصورت الفاظ و استعارات استعمال کیے۔

حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت نے کبھی عورت کے مکمل وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا اور اس سے تعلق کو سماوی بادشاہت میں داخلے کی واحد رکاوٹ قرار دے کر اسے معاشرے کی گری پڑی چیز بنا دیا۔ عورت کو کمتر اور گناہ کی جڑ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی معاشرے میں خواتین کی بے حرمتی، ہم جنس پرستی اور محرّمات کے ساتھ مباشرت جیسے گناہوں نے اطوار مضبوطی سے جڑیں پکڑ گئے۔ خواتین کی عدم برداشت اور اُن کی مادرانہ شفقت اور فطری جذبات پرکزی اور غیر ضروری پابندیوں نے عورت کے وجود کے خاکی اور روحانی دونوں حصوں کو بری طرح مجروح کیا۔ پہلے عورت کو برائیوں کی جڑ قرار دے کر ذلت کے گڑھوں میں دھکیل دیا گیا، پھر احساسِ ندامت کو کم کرنے کے لیے nuns کا ادارہ قائم کیا گیا جس کے ذریعے بے شک انہیں کچھ عزت ملی، لیکن وہ بھی اتنی بڑی قیمت ادا کر کے، یعنی غیر شادی شدہ ہونا شرط قرار پایا۔

عورت کی فطری شفقت اور ممتا کو برباد دیا گیا۔ عورت، جسے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے عمل کے قابل بنایا، دنیا میں اُس کی اس صلاحیت کی بے قدری کی گئی۔ آج مغرب کی عورت اپنی اسی مادری شفقت کو کتوں بلیوں پر لٹاتی نظر آتی ہے۔ چرچ نے عورت کی اس قدر تحقیر کی ہے کہ مغربی عیسائی اب انسانی ازدواجی زندگی کے دائروں سے نکل کر بچوں اور جانوروں سے بدفعی کرتے نظر آتے ہیں۔ "Time" کی ۳ جولائی ۱۹۹۵ء کی اشاعت کے مطابق عربیوں کے

فحش فلموں اور کمپیوٹر پروگراموں کی مارکیٹ کا وسیع حصہ مغربی عیسائی خواتین کی کتوں سے
مباشرت پر مبنی تصاویر پر مشتمل ہے۔ آج مغرب کی نفسیات اور بد اعمالیوں کی وجہ وہ خرافات
ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام منسوب کر کے الہامی کتابوں میں شامل کر دیا گیا۔

عورت کی آزادی: تاریخ کی نظر میں

۱۹۰۷ء میں نیویارک کی ملبوسات سازی کی صنعت سے وابستہ محنت کش خواتین نے
پہلی بار خواتین کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ اُن کا مطالبہ دس گھنٹے مسلسل کام کے بدلے
اُن کی تنخواہوں اور سہولیات میں اضافہ اور اوقات کار میں کمی وغیرہ کا تھا۔ لیکن اس کے
جواب میں اُن خواتین کو پولیس کے تشدد اور لاطھی چارج کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح ۱۹۰۸ء
میں سوئی سازی کی صنعت سے وابستہ خواتین کا بھی یہی انجام ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں عالمی کانفرنس
نے عورتوں کا عالمی دن منانے کی سفارش کر دی جو ۱۹۵۶ء میں اقوام متحدہ نے مان لی اور
۸ مارچ عورتوں کا عالمی دن تسلیم کیا گیا۔ یہ بات ہمارے لیے ناقابل فہم ہے کہ ہمارا کیا واسطہ
ہے اس دن سے جو ہم مغرب کے حقوق کے علم بردار بن کر یہ دن منائیں؟

تشدد، نا انصافی، مردوں کا تعصب اور امتیازی رویے یقیناً دنیا بھر کی عورتوں کے اجتماعی
مسائل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ:

- (۱) کیا سرکوں پر آ کر مغرب کی عورت کو وہ سب کچھ مل گیا ہے جو وہ حاصل کرنا چاہتی تھی؟
 - (۲) کیا مسلمان عورتوں کے مسائل کی وجوہات وہی ہیں جو مغربی عورتوں کی ہیں؟
- جہاں تک مغرب کی عورت کا تعلق ہے وہ مذہب بیزار ہے۔ اُس کے ساتھ ظلم یہ ہوا
ہے کہ وہ اپنے ساتھ برتے گئے مظالم اور مذہبی تحقیر کی زنجیر سے آزاد ہوتے ہوئے معاشی
غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی۔ فکری اور معاشی آزادی کے لیے مغربی عورت اپنے آپ کو
بنا سنوار کر رکھتی ہے۔ اب وہ اپنے حسن کا اظہار اپنے شوہر کے لیے نہیں بلکہ اُن مردوں کے
لیے کرتی ہے جنہوں نے چند کرنسی نوٹوں کے عوض انہیں معاوضے پر ملازم رکھا ہوتا ہے۔ یہ
عورت اپنی معاشی آزادی کے لیے اپنی رضا و رغبت اور منشا سے اپنی عفت گنوا کر اُس پر فخر کرنا
بھی سیکھ گئی ہے۔

مسائل مشرق کی عورت کے بھی بہت سنگین ہیں، لیکن ان مسائل کی وجہ وہ نہیں جو مغرب
کی عورت کی ہے۔ مغربی عورت کے برعکس ہم جب باہر نکلیں اور کوئی اوباش آوازہ کسے تو
چپل اتار کر اُس کی وہ درگت بناتی ہیں کہ ہمیشہ یاد رہے۔ یہ نفسیات کا فرق کیوں ہے؟ اس کی

وجہ وہ احترام ہے جو ہم فطری طور پر مسلمان ہونے کے ناطے جانتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کے قدموں میں جنت رکھی ہے، بیٹیوں کی پرورش کرنے والے کو حضور اکرم ﷺ نے جنت میں اپنے ساتھ دو انگلیوں کی طرح جڑا ہوا بتایا ہے، بیوی کو بہترین متاع اور عورت کو نازک آہنگیوں سے تشبیہ دی ہے۔ ہادی عالمہ ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے ہمیں وہ کچھ دے دیا جس کا آج بھی مغربی عورت تصور تک نہیں کر سکتی۔ مثلاً وراخت میں حصہ روزی کمانے کی تکھن ذمہ داری سے آزادی۔ اور آپ ﷺ نے نکاح آسان کر کے اور اس کی حدود بتا کر زنا کے تمام راستے بند کر دیے۔

مشرق کی عورت کو اُس کے حقوق کیوں نہیں ملے؟

سچی بات تو یہ ہے کہ مشرقی عورت نے اپنی اولاد کو اسلامی تعلیم و تربیت سے محروم رکھ کر اور مغربی تہذیب کو گلے لگا کر نہ صرف اُس پر بلکہ اپنے اوپر بھی بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو عورت ہی جہیز طلب کرتی نظر آتی ہے۔ بہو سے بدسلوکی کون کرتا ہے؟ عورت! ساس کے ساتھ بدسلوکی کر کے اپنی اولاد کے لیے بری مثال کون قائم کرتا ہے؟ عورت! حد سے بڑھی ہوئی نمائش پسندی، زیورات، ملبوسات، بدعات، سامانِ آرائش و زیبائش کی خواہش کون کرتا ہے؟ عورت! — چنانچہ رشوت اور سود کی ذمہ دار عورت ہے۔ شوہر اگر تھک دکتا ہے تو اُس کی پرورش کس نے کی ہے؟ عورت نے! عورتوں کو گھروں سے نکلنے پر مجبور کس نے کیا؟ عورت نے! اور وہ اس طرح کہ اگر ہم خواتین درزنوں سے کپڑے سلواتیں تو وہ گھروں میں بیٹھ کر روزگار کماتیں، پٹرول پمپوں پر نہ کھڑی ہوتیں۔ ہم اپنے بیٹوں کے رشتوں کے لیے ڈاکٹر، انجینئر، ایم ایس سی لڑکیوں کی تلاش نہ کرتیں تو بچیاں پیشہ ورا نہ تعلیم کے حصول کے بجائے گھروں کو سنوارتیں، لیکن ہم نے اُن کے نازک کندھوں پر دفتر کی ذمہ داری ڈال کر گھر کی ملکہ کو کلرک بنا دیا۔ صرف مصنوعی معیار زندگی کو بلند کرنے کے بجائے اگر ہم عورتیں سادگی اختیار کرتیں تو مردوں کے لیے حلال روزی کمانے کے زیادہ مواقع میسر آتے۔

اسلام نے قدرت رکھنے والے مرد کو ایک سے زائد شادیوں کی اجازت دی، لیکن پھر بھی کتنی ہی لڑکیاں غیر شادی شدہ بیٹھی ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ عورت اپنے شوہر کی تاک تک جھانک تو برداشت کر لیتی ہے، لیکن اسے دوسری شادی کی اجازت دے کر کسی لڑکی کو اچھی زندگی گزارنے کا موقع دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

کیا مرد کے لیے ڈوب مرنے کا مقام نہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی بیوی سے مانگے ہوئے برتن، بستر اور فرنیچر استعمال کرتے ہوئے گزار دیتا ہے! جھیز کی بے غیرتی کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کی بے دین ماں!

نہ تو عورت کو کتاب و سنت کی تعلیم دی جاتی ہے اور نہ ہی اسے اسلامی عبادات و معاملات کے بارے میں بتلایا جاتا ہے۔ نہ وہ پاکی و ناپاکی کے مسائل جانتی ہے نہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے مسائل کا اسے علم ہوتا ہے۔ اسے اسلامی اخلاق نہیں سکھائے جاتے۔ چنانچہ اُس کی زندگی غیبت، چغلی، قطع رحمی اور زبان کے غلط استعمال جیسے برے اخلاق میں گزر جاتی ہے۔

عورت کے سرپرست پر لازم ہے کہ وہ اسے علمِ دین سے روشناس کرائے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ترغیب دے اور گھر کا ماحول ایسا بنائے کہ وہاں عبادت و اطاعت آسان اور فسق و فجور مشکل ہو، لیکن گھر کا سرپرست یہ سب کچھ بھی کر سکے گا جب اُس کی ماں نے اسے سکھایا ہوگا۔

Cat Stevens جسے ہم یوسف اسلام کے اسلامی نام سے جانتے ہیں، جب اس سے اسلام قبول کرنے کے بعد پوچھا گیا کہ اسلام تو عورتوں کو قید کر کے رکھتا ہے اور اُن سے برا سلوک کرتا ہے، تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو اُس نے جواب دیا: ”میں زیادہ کچھ نہیں جانتا، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں اپنی والدہ کو اپنے پاس لے آیا ہوں اور ان کی خدمت کر کے سکون محسوس کرتا ہوں۔“

وہ دین جس کو اپنا کر غیر بھی ماں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، ہم نے اس دین پر پیدا ہونے والے بچوں کو دین سے بے بہرہ رکھ کر اور مغرب کی تقلید سکھا کر خود کو اکیلا کر لیا ہے اور اُن کے دلوں سے اپنا احترام خود ہی کم کر دیا ہے۔

مشرق کی عورت کو کیا کرنا چاہیے!

اس وقت میڈیا اور این جی او ز فاشی اور بے راہ روی کو ہمارے گھروں تک لے آئے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان اسباب کو دُور کریں جو خواتین کو دین اسلام سے دُور لے جا رہے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عورت کو اُس کے اسلامی حقوق و فرائض اور حدود و قیود کے بارے میں آگاہ کیا جائے، تاکہ دنیا داری کی جگہ گاتی رنگینیاں اس کی معصوم آنکھوں کو چندھیا نہ سکیں، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اپنے اوپر اسلام کی تعلیمات کو لازم کر لیں اور

زندگی کے ہر گوشے کو اس کے مطابق ڈھال لیں۔ تبھی یہ ممکن ہوگا کہ ہم اپنے بیٹوں کی تربیت صحابیات رضی اللہ عنہن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کر سکیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ نظام خلافت کی جدوجہد میں عورتیں سب سے آگے ہوں، تاکہ اُن کے اجتماعی حقوق جو دین اسلام نے انہیں چودہ سو سال پہلے دیے تھے، عملی طور پر انہیں حاصل ہوں، لیکن حقوق حاصل کرنے کے لیے انہیں اپنے دینی فرائض پہلے ادا کرنے ہوں گے اور گھروں میں رہ کر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی ہوں گی، نہ کہ سڑکوں پر نکل کر یا مغرب کی پیروی کر کے۔ ۰۰

شادی بیاہ کی تقریبات میں سنت کے مطابق اصلاح

بانی تنظیم کے خطاب پر علماء کرام کے تہنیتی خطوط اور ان کے جواب

(۱)

بخدمت عالی شان جناب عالی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حفظہ اللہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ وبعد:
طالب دعاء خیر بخیر واللہ الحمد۔

خلاصۃ المرام اینکہ الحمد للہ ماہنامہ ”میتاق“ و ماہنامہ ”حکمت قرآن“ کا مستقل قاری
ہوں اور ہر ماہ ان دونوں میں آپ کے چھپنے والے دروس کو شوق و رغبت سے پڑھنے کی
سعادت حاصل کرتا ہوں۔ ماہنامہ میتاق کے پچھلے دو شماروں یعنی ماہ اپریل و ماہ مئی کے
شماروں میں ”شادی بیاہ کی تقریبات میں سنت کے مطابق اصلاح“ ایک ایسا مضمون و مقالہ
ہے جو ہر مصلح و محب سنت کے دل کی آواز ہے۔ ماہ مئی کے شمارے میں جو نکاح کا خطبہ بیان
کیا گیا ہے، تو یہ بات ظاہر کرتے ہوئے افسوس کا جذبہ غالب ہے کہ ہمارے سندھ کے اکثر
نکاح خوان حضرات جن کو ”قاضی“ کہا جاتا ہے، نے اس عظیم خطبہ کو نسیا منیا کر دیا ہے اور
نکاح خوانی کے وقت دو لہا کو ایمان مفصل و ایمان مجمل پڑھا کر پھر جو ایک لمبی و طویل بنائی
ہوئی دعاء اس کو پڑھتے ہیں اور اسی کو اصل خطبہ سمجھا جاتا ہے اور ان کی تعمیل نہ کرنے والے
کو حقارت و نکارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ الا ماشاء اللہ!

جب آپ کا بیان کردہ نکاح کا خطبہ پڑھا تو ان کے الفاظ میں کچھ کمی بیشی نظر آئی جس
نے دستیاب کتب حدیث دیکھنے کا داعیہ پیدا کیا۔ کتب حدیث کے دیکھنے کی سعادت کے
بعد یہ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھتے ہوئے اگرچہ احساس ہے کہ علم نہیں کم مانگی ہے اور اردو
کی عدم معرفت عبارت کے بنانے میں مغل ضرور ہے لیکن اصل مقصد و مدعا ہے کہ حضور نبی
کریم ﷺ کی سنت واضح ہو جائے اور اسی سنت کی اتباع میں ہماری ہدایت و کامیابی

کارا زمضر ہے۔

تو اب اصل مدعا کی طرف لوٹا جاتا ہے۔ آپ نے خطبہ کی ابتدا ”الحمد لله“ سے کی ہے، حالانکہ اکثر احادیث میں خطبہ کی ابتدا ”إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ“ سے ہے۔ ہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ابن ماجہ کی روایت (ص ۱۳۶) سے ابتدا ”الحمد لله“ سے معلوم ہوتی ہے۔ اور آپ نے ”وَنَسْتَغْفِرُهُ“ کے بعد ”وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ“ کے الفاظ زیادہ کیے۔ بندۂ پُرَّقصیر کو دستیاب کتب حدیث جیسے سنن ترمذی، ص ۲۰۱، ج ۱، سنن النسائی، ص ۵۸، ج ۲، سنن ابی داؤد، ص ۲۹۶، ج ۱، سنن ابن ماجہ، ص ۱۳۶، مسند احمد، ص ۵۱۰ و ۵۶۰، ج ۱، مرقات المفاتیح، شرح مشکوٰۃ المصابیح، ص ۲۱۴، ج ۶، بلوغ المرام، ص ۳۶۵، حجتہ اللہ البالغہ، ص ۲۷۹، ج ۲، جمع الفوائد، ص ۵۷۲، ج ۲، اصول المنج الاسلامی، ص ۴۷۰، الوابل الصیب، ص ۷۵ میں سے کسی بھی ایک کتاب میں یہ الفاظ نہیں ملے۔ اس لیے آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر یہ مذکورہ الفاظ کسی حدیث کی کتاب میں موجود ہیں تو مع حوالہ ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ حقیقت معلوم ہو۔ یشکر اللہ سعیکم اور آئندہ شمارے میں ان کا ذکر فرمائیں۔ ”وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شَرِّهِ“ کے بعد ابن ماجہ، ص ۱۳۶ اور سنن الترمذی، ص ۲۱۰، ج ۱ میں ”وَسَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا“ کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اگر اضافہ کر دیا جائے تو سنت سے ثابت شدہ ہیں۔ (ابن ماجہ میں من سیئات اعمالنا ہے جبکہ ترمذی میں بغیر ”مِنْ“ کے ہے) ”وَمَنْ يَضِلُّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ“ میں ”يَضِلُّهُ“ کا لفظ صرف سنن ترمذی، ص ۲۱۰، ج ۱ میں ہے باقی کتب حدیث میں ”وَمَنْ يَضِلُّ“ (بغیر ضمیر) کے ہے۔

خطبہ کے آخر میں شہادتین کا ذکر ہے جو حقیقت میں اسلام کی جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن کتب حدیث میں شہادتین مضارع، واحد متکلم کے صیغہ کے ساتھ ہے جبکہ آپ نے مضارع جمع متکلم یعنی ”وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ مُحَمَّدًا عَبْدَهُ وَرَسُولَهُ“ ذکر فرمایا، جبکہ کتب حدیث میں ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ“ صرف ابن ماجہ میں ”وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ“ کے لفظ ہیں) (واشہد ان محمدًا عبده ورسوله“ کے لفظ ہیں، لہذا ہمیں آپ ﷺ کی اتباع میں جمع کے بجائے واحد کے لفظ سے شہادتین خطبہ نکاح میں پڑھنا چاہیے۔

باقی سنن ابی داؤد، ص ۲۹۶، ج ۱ میں اس کے بعد ”أَرْسَلَهُ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا بَيْنَ يَدَيْ السَّاعَةِ“ من يطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعصمها فانه لا يضره الا نفسه ولا

يضر الله شيئا“ کے الفاظ زیادہ مذکور ہیں۔

آخر میں اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اور نبی کریم ﷺ کی پوری امت کو کتاب و سنت کی اطاعت و اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

والسلام

خادم

نذیر احمد بن الحافظ عبدالحق چتر

امام و خطیب جامع مسجد عمر فاروق ڈاک خانہ حیات پتانی

تحصیل میر پور ماہیلہ، ضلع گھوگئی، سندھ

جواب

مکرمی جناب مولانا نذیر احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے تو میں اس بات پر آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ہمارے جرائد کا اس وقت نظر سے مطالعہ کرتے ہیں، نیز ہماری کوششوں کو سراہتے بھی ہیں اور غلطیوں کی نشاندہی بھی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو نصیح و خیر خواہی کرنے پر اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین!

آپ نے ”اسلامی معاشرت“ کے عنوان سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مضمون کے حوالے سے جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے ان کے ضمن میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

بلاشبہ خطبہ مسنونہ میں ”وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ“ کے الفاظ نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً نقل نہیں ہوئے، البتہ چونکہ اپنے مفہوم میں یہ عقیدہ کے مبادیات کے عین مطابق ہیں اس لیے بعض خطباء اور واعظین انہیں بھی حمد و ثناء میں شامل کر لیتے ہیں۔ البتہ آپ نے درست نشاندہی فرمائی ہے کہ الفاظ وہی استعمال کرنا بہتر ہے جو نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً نقل کیے گئے ہیں۔

جہاں تک شہادتین کو واحد متکلم کے بجائے جمع متکلم میں ادا کرنے کا معاملہ ہے تو اگرچہ احادیث میں یہ واحد متکلم کے صیغے میں آتی ہیں لیکن علماء کے مابین اس بات کو جائز سمجھا جاتا ہے کہ ادعیہ ماثورہ وغیرہ میں واحد کی بجائے جمع کا صیغہ اور جمع کی جگہ واحد کا صیغہ

استعمال کر لیا جائے۔ یہی قول شہادتین کے حوالے سے بھی ملتا ہے۔ البتہ مناسب یہی ہے کہ
 صیغوں کی تبدیلی بھی نہ کی جائے، تاہم جواز کی حد تک صیغوں کی تبدیلی درست ہے۔
 خطبہ مسنونہ کی باقی عبارت ابن ماجہ کی صحیح روایات سے ثابت ہے۔ یہ روایات
 حضرات عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ (صحیح سنن ابن ماجہ جلد
 اول، ص ۳۱۹۔ علامہ ناصر الدین البانی)

میں ایک مرتبہ پھر اپنی طرف سے اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرف سے آپ
 کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہمارا رابطہ برقرار رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

والسلام

عاطف وحید

انچارج شعبہ تحقیق اسلامی

(۲)

مکرمی ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بغیر کسی تمہید کے اصل مدعا کی طرف آتا ہوں۔ ماہنامہ ”میشاق“ کی اشاعت بابت
 اپریل مئی ۲۰۰۵ء میں ”شادی بیاہ کی تقریبات میں سنت نبوی کے مطابق اصلاح“ کے ضمن
 میں آپ کے پُر مغز مقالے طبع ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ اس
 گئے گزرے دور میں عامۃ المسلمین کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے قرآن و سنت کی روشنی میں
 اپنا موقف عام فہم انداز میں بڑی دلسوزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

محترم! آپ کے متذکرہ بالا ہر دو مقالہ جات اپنی جگہ کامل اور مکمل ہیں اور بات مکمل
 طور پر سمجھ میں آئی ہے، تاہم احقر آپ سے گزارش کرتا ہے کہ جہاں آپ نے خطبہ نکاح،
 بارات کی لعنت، جہیز کی حقیقت اور دعوت و لیمہ مسنونہ کی ضرورت و اہمیت پر بات کی ہے، اگر
 ہمارے ہاں مروّج ایجاب و قبول اور اس ضمن میں مروّجہ بدعات کے حوالے سے بھی قرآن و
 سنت کے احکامات بیان فرمادیں تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔ احقر اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے ایک
 تقریب نکاح کا حال بیان کرتا ہے جس سے بات واضح ہو جائے گی۔ ہمارے مفتی قبلہ محترم
 محمد اویس خان ایوبی صاحب ماشاء اللہ مکہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اور مدینہ یونیورسٹی میں

تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہنے کی سعادت سے بہرہ مند ہیں۔ مطلب یہ کہ ماشاء اللہ عالم باعمل ہیں۔ ایک نکاح کے موقع پر جو یہاں میر پور آزاد کشمیر کے مضافات میں ہوا، سرکاری نکاح خوان جو ایک اُن پڑھ سے ”مولوی“ تھے، فارم نکاح وغیرہ پُر کر چکنے کے بعد دلہن سے ایجاب و قبول کی غرض سے لڑکی (دلہن) کے والد اور دیگر گواہوں کے ہمراہ اندر گھر میں جہاں دلہن بیٹھی تھی، جانے لگے تو مفتی صاحب نے مولوی صاحب (نکاح خوان) کو پکڑ لیا کہ حضرت! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ جب لڑکی کا والد زندہ موجود ہے اور وہ دلہن سے نکاح فارم پر دستخط کروا سکتا ہے تو آپ کا اندر زنان خانہ میں جانا چنداں ضروری نہیں، اور یہ کوئی شرط نکاح بھی نہیں۔ مفتی صاحب قبلہ نے اس کی حکمت بھی بتائی کہ ایسے موقعوں پر خواتین نے معمول سے زیادہ ہی آرائش و زیبائش کا اہتمام کیا ہوتا ہے، چنانچہ ”مولوی لوگ“ تاکی جھانکی کر کے گناہگار ہوتے ہیں وغیرہ۔

بہر حال آپ سے استدعا ہے کہ آپ ایجاب و قبول کے لیے مسنون طریقہ، لڑکی کا والد موجود ہو تو کیا پھر بھی لڑکی سے ایجاب و قبول ضروری ہے، کیا موجودہ فارم نکاح وغیرہ پہ دستخط ایجاب و قبول کے مترادف ہیں، وغیرہم معاملات پر اپنی عالمانہ رائے سے نواز کر عند اللہ مأجور ہوں۔ ایجاب و قبول اور نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں جو مذموم اور ہندوانہ رسوم و رواج فروغ پا چکے ہیں، ان کا قلع قمع نہ سہی، ان کے آگے شعوری بند باندھنے کے لیے آپ کی پُر اثر تحریر یقیناً کام دکھائے گی۔ زیادہ آداب!

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خیر اندیش

بندۂ بندگان الہی

اعظم حسین گیلانی

میر پور۔ آزاد کشمیر

☆☆☆

محترم اعظم حسین گیلانی صاحب کے توجہ دلانے پر ہمارے شعبہ تحقیق اسلامی کے ریسرچ ایسوسی ایٹ حافظ محمد زبیر صاحب نے ”نکاح کا صحیح اور شرعی طریقہ کار“ کے عنوان سے ایک مضمون مرتب کیا ہے، جو آئندہ صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔

نکاح کا صحیح اور شرعی طریقہ کار

حافظ محمد زبیر ☆

اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے اس سلسلہ کو برقرار رکھنے کے لیے نکاح کا حکم جاری فرمایا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ﴾ (النور: ۳۲)

”اور اپنے میں سے بے نکاح مرد اور عورتوں کا نکاح کرو۔“

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کی بہت ساری ایسی احادیث ملتی ہیں جن میں مسلمانوں کو بالعموم اور نوجوانوں کو بالخصوص نکاح کی رغبت دلائی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ))^(۱)

”اے نوجوانوں کی جماعت! جو بھی تم میں سے نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ نکاح کر لے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللَّهِ إِعَانَتُهُمْ : الْمُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالنَّكَاحُ يُرِيدُ أَنْ يَسْتَعْفِفَ وَالْمُكَاتِبُ يُرِيدُ الْأَدَاءَ^(۲)

”تین افراد ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اُن کی مدد کو لازم قرار دیا ہے؛ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا، اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کے لیے نکاح کرنے والا اور

☆ ریفرنس: ایسوی ایٹ شعبہ تحقیق اسلامی قرآن اکیڈمی لاہور

(۱) صحیح ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب ما جاء فی فضل النکاح۔ وصحیح سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب التحریض علی النکاح۔

(۲) حاکم و دارقطنی بحوالہ نیل الاوطار، جلد ۶، ص ۲۲۶، محمد بن علی بن محمد الشوکانی، دار الفکر بیروت۔

ایسا مکاتب (غلام جو کہ اپنے مالک سے معاہدہ کر لے کہ وہ اسے اتنی رقم ادا کرے گا جس کے بدلے میں مالک اس کو آزاد کر دے گا) جو کہ ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو۔

نکاح کی حکمت:

- اسلام کا مقصد نکاح کے ذریعہ سے درج ذیل مقاصد کا حصول ہے:
- (۱) نکاح کے نتیجہ میں اعضاءِ تناسل کے ذریعہ سے نسل انسانی کی بقاء۔
 - (۲) اپنی عزت کی حفاظت اور فطری خواہش پوری کرنے کے لیے مرد اور عورت کا رشتہ ازدواج۔
 - (۳) نسل انسانی کی تربیت اور زندگی کی بقاء کے لیے دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون
 - (۴) مودت اور محبت کے دائرہ میں مرد اور عورت کا ایسا باہمی تعلق جس سے دونوں کے حقوق کا تحفظ اور ایک دوسرے کا تعاون حاصل ہو۔^(۱)

شریک حیات کا انتخاب:

جب کوئی مسلمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے نکاح کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس میں سب سے پہلا مرحلہ ایک اچھی شریک حیات کا انتخاب ہے۔ شادی کے وقت عام طور پر لڑکی کے حسن و جمال، مال و دولت اور خاندان کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((تَنْكَحِ الْمَرْأَةَ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَلِجَمَالِهَا، وَلِدِينِهَا، فَاطْفُرْ بِذَاتِ الدِّينِ))^(۲)

”عورت سے چار وجوہات کی بنیاد پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب نسب (خاندان) کی وجہ سے، اس کے حسن کی وجہ سے، اس کی دین داری کی وجہ سے۔ پس تم (عورت سے نکاح کے وقت) اس کی دین داری کو ترجیح دو۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے نکاح میں اصل معیار دین داری کو بنایا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ایک عورت کتنی ہی مالدار یا حسین کیوں نہ ہو اگر وہ بد اخلاق اور منہ پھٹ ہوگی تو وہ مرد کی

(۱) منهاج المسلم، فضيلة الشيخ ابو بكر جابر الجزائري، ص ۶۱۳، ۶۱۴

(۲) صحيح البخارى، كتاب النكاح، باب الاكفاء فى الدين۔ وصحيح مسلم، كتاب الرضا، باب استحباب نكاح ذات الدين۔

ساری زندگی اجیرن کر چھوڑے گی۔

لڑکی کے انتخاب کے بعد اگلا مرحلہ پیغام نکاح کا ہے۔ اس سلسلے میں سنت کے مطالعے سے درج ذیل اصول ہمارے سامنے آتے ہیں:

(۱) منگنی پر منگنی کرنے کی ممانعت: اگر کسی مسلمان بھائی کے رشتے کی بات کہیں چل رہی ہو یا رشتہ طے پا چکا ہو تو وہاں اپنے رشتے کے لیے پیغام بھیجنا حرام ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا يَخْتَبُ الرَّجُلُ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ حَتَّى يَنْكَحَ أَوْ يَتْرُكَ))^(۱)

”کوئی مسلمان ایسی جگہ نکاح کا پیغام نہ بھیجے جہاں اس کے کسی دوسرے بھائی کے رشتے کی بات چل رہی ہو، یہاں تک کہ وہ اس سے نکاح کر لے یا اس کا خیال ترک کر دے۔“

(۲) منخطوبہ (جس کو پیغام نکاح بھیجا ہے) کو ایک نظر دیکھنے کا بیان: منخطوبہ کو شادی سے پہلے ایک نظر دیکھنا جائز ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے:

أَنَّهُ خَطَبَ امْرَأَةً فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((انظُرْ إِلَيْهَا فَإِنَّهُ آخِرَى أَنْ يُؤَدَّمَ بَيْنَكُمَا))^(۲)

”انہوں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ”اس کو ایک نظر دیکھ لو۔ یہ تمہارے درمیان محبت میں اضافے کا باعث ہوگا۔“

اسلام میں منگنی کا تصور وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے، لیکن منگنی کے نام سے عجیب و غریب قسم کی بدعات اور خرافات مسلمان معاشرے میں عام ہو چکی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) منگنی کو باقاعدہ ایک رسم کے طور پر منانا (celebration) اس میں دعوت کا اہتمام کرنا، ویڈیو بنوانا اور مردوزن کا اختلاط۔

(۲) لڑکے کا اپنی منگیتر کے ساتھ ملاقاتیں کرنا یا ٹیلی فون کرنا۔

ہاں اگر لڑکے والوں کی طرف سے اس موقع پر لڑکی کو کوئی انگوٹھی وغیرہ پہنادی جائے یا کپڑوں کے کچھ جوڑے تحفہ کے طور پر بھیج دیے جائیں تو اس میں کوئی حرج والی بات نہیں ہے۔ اس سے بات ذرا زیادہ بچتہ ہو جاتی ہے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لا یخطب علی خیطبۃ اخیه حتی ینکح او یدع۔

(۲) جامع الترمذی، کتاب النکاح عن رسول اللہ، باب ما جاء فی النظر الی المخطوبۃ۔

لوگ عام طور پر نکاح اور منکفی میں فرق نہیں کرتے، حالانکہ منکفی تو صرف لڑکی اور لڑکے والوں کے درمیان ایک عہد و پیمان کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے مطابق دونوں فریق مستقبل میں نکاح کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ بعض اوقات نکاح کی تاریخ وغیرہ منکفی کے موقع پر ہی طے ہو جاتی ہے اور بعض اوقات یہ بعد میں طے ہوتی ہے۔ بہر حال منکفی کے بعد نکاح کا مرحلہ آتا ہے۔ اب ہم قرآن و سنت کی روشنی میں نکاح کے صحیح طریقہ کار کو واضح کرتے ہیں:

نکاح کے لغوی معنی غالب آنے اور ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانے کے ہیں۔^(۱)

اس کی اصطلاحی تعریف یوں ہے:

عَقْدٌ بَيْنَ الزَّوْجَيْنِ يَجْلِبُ بِهِ الْوَطْأُ^(۲)

”زوجین کے درمیان ایسا معاہدہ جو کہ مباشرت کو حلال کر دے۔“

نکاح کے ارکان و شرائط

نکاح کے درج ذیل ارکان و شرائط ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی رہ جائے تو نکاح صحیح نہ ہوگا، بلکہ باطل یا فاسد ہوگا۔ اس لیے نکاح کے وقت ان چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

(۱) ”ولی“ کا ہونا: دورانِ نکاح ”ولی“ کے حوالے سے فریقین کو درج ذیل باتوں کا دھیان رکھنا چاہیے:

(۱) نکاح میں لڑکی کی طرف سے ولی کا ہونا ضروری ہے، جبکہ لڑکا اپنا ولی خود ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ))^(۳) ”ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہوتا۔“

(۲) عورت کا ولی اس کا باپ ہوگا۔ باپ کی عدم موجودگی میں سب سے قریبی عزیز یا بچی کے خاندان میں سے کوئی صاحب الرائے یا حاکم وقت ہوگا۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے:

((لَا تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ إِلَّا بِأَبْنِهَا أَوْ ذِي الرَّأْيِ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ السُّلْطَانِ))^(۴)

(۱) القاموس المحيط، علامة مجد الدين فيروز آبادی، جلد اول، ص ۲۵۴۔

(۲) نیل الاوطار، محمد بن علی بن محمد الشوکانی، جلد ۶، ص ۲۲۷، ۲۲۸، دار الفکر بیروت۔

(۳) صحیح سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی الولی۔ صحیح سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب لا نکاح الا بولی۔

(۴) موطا الامام مالک، کتاب النکاح، باب عن سعید بن المسیب انه قال قال عمر بن الخطاب لا تنکح المرأة.....

”عورت کا نکاح اس کے ولی (باپ یا قریبی عزیز) یا خاندان کے کسی بڑے سمجھدار یا حاکم وقت کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے“۔

(۳) ولی کی ولایت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کا اہل ہو۔ یعنی ولی کے لیے مردِ بالغ، عاقل، معاملہ فہم اور آزاد ہونا ضروری ہے۔

(۴) اگر لڑکی کنواری ہو اور ولی باپ ہو تو لڑکی سے اجازت حاصل کرے کہ فلاں کے ساتھ اس کا نکاح کرنا چاہتا ہے۔ اور باپ اگر اس کے سامنے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے نکاح کا تذکرہ کرے اور وہ جواباً خاموشی اختیار کرے تو یہی اس کی اجازت ہے۔ اس کے برعکس اگر لڑکی بیوہ ہو یا ولی غیر باپ ہو تو وہ صریح الفاظ میں اس کی رائے حاصل کرے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((الَايِمَ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا، وَالْبِكْرُ تُسْتَأْذَنُ فِي نَفْسِهَا، وَإِذْنُهَا صُمَاتُهَا))^(۱)

”بیوہ اپنے نفس کے بارے میں اپنے ولی سے زیادہ حق دار ہے جبکہ کنواری سے اس کی ذات کے بارے میں اجازت طلب کی جائے گی اور اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے“۔

(۵) اگر خدانخواستہ بچی اور اس کے ولی کے درمیان نکاح کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو جس کا موقف دینی مصلحت پر مبنی ہوگا اس کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر ولی اپنے غلط موقف پر ڈٹا ہوا ہے اور بچی کی شادی ایسی جگہ کرنا چاہتا ہے جو اُس کے لیے بالکل بھی مناسب نہ ہو تو خاندان کا کوئی بڑا یا عادل ولی بن کر اس بچی کا نکاح کرائے گی۔ اور اگر بچی کا موقف دینی نقطہ نظر سے غلط ہو تو اُس کی بات نہیں مانی جائے گی۔

کورٹ میرج اور اس کی شرعی حیثیت:

ایسی لڑکیاں جو کہ اپنے آشنائوں کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی ہیں اور کورٹ میرج کر لیتی ہیں، کبیرہ گناہ کی مرتکب ہوتی ہیں۔ ایسا نکاح جمہور علماء کے نزدیک باطل جبکہ احناف کے ہاں فاسد ہے۔ مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ ایسی لڑکیاں گھر سے بھاگ کر والدین کی بدنامی و رسوائی کا باعث بنتی ہیں۔ وہ ساری عمر کسی کومنہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ اکثر ایسی شادیوں میں جب دو چار دن بعد عشق کا نشہ ہرن ہوتا ہے تو لڑکی کے ہاتھ سوائے ذلت و رسوائی کے کچھ نہیں آتا، اور روزمرہ کے لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے طلاق تک نوبت آ جاتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ عورت میں اس بات کی صلاحیت و استعداد موجود نہیں ہوتی کہ وہ اپنا چیون

(۱) موطا الامام مالک، کتاب النکاح، باب استئذان البکر والایم فی انفسہما

ساتھی خود منتخب کر سکے۔ وہ عموماً مرد کے دھوکے میں آ جاتی ہے اور ایک اجنبی مرد کی خاطر اپنے محسنین، بہن بھائیوں حتیٰ کہ والدین تک کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اسی لیے شریعت نے نکاح کے معاملے میں عورت کے لیے ولی کو لازم قرار دیا ہے۔ مبادا عورت اپنے جذبات میں کوئی غلط فیصلہ کر کے اپنی زندگی تباہ و برباد کر لے۔ اگر باپ کی طرف سے کوئی کوتاہی ہو رہی ہو، وہ اپنی بچیوں کی شادیوں میں تاخیر سے کام لے رہا ہو یا اُن کے رشتے کسی مناسب جگہ پر طے نہ کر رہا ہو تو ایسی صورت حال میں ولایت خود بخود سب سے قریبی عزیز یا خاندان کے کسی دوسرے بڑے اور سمجھ دار بزرگ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، تاکہ بچیوں پر ظلم نہ ہو۔

(۲) دو گواہوں کی موجودگی: نکاح کے موقع پر کم از کم دو عادل گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ عادل سے مراد یہ ہے کہ وہ کبیرہ گناہ کے مرتکب نہ ہوں اور اکثر صغیرہ گناہوں سے بھی اجتناب کرتے ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ (الطلاق: ۲)

”اور اپنوں میں سے دو عادل افراد کو گواہ بنا لو۔“

گناہ کبیرہ کے مرتکب افراد عادل نہیں ہیں، لہذا مذکورہ آیہ مبارکہ کی روشنی میں زانی، شرابی یا سود کھانے والا گواہ نہیں بن سکتے۔ یہ آیہ مبارکہ اگرچہ طلاق کے باب میں نازل ہوئی ہے، لیکن نکاح کے معاملے کو بھی اسی پر قیاس کیا گیا ہے۔ دورِ حاضر میں چونکہ عدالت کی صفات کے حاملین افراد کی کمی ہے اس لیے مجلس نکاح میں زیادہ سے زیادہ افراد ہونے چاہئیں۔ گواہوں کی عدم موجودگی میں کیا جانے والا نکاح صحیح نہ ہوگا۔

(۳) حق مہر: نکاح صحیح کے لیے تیسری شرط ”مہر“ کی ہے۔ عورت کو حلال کرنے کے لیے خاوند جو مال دیتا ہے وہ ”مہر“ کہلاتا ہے۔ مہر کا ادا کرنا واجب اور فرض ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدَقَتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (النساء: ۴)

”اور عورتوں کو اُن کے مہر خوشی سے ادا کرو۔“

حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو نکاح کے موقع پر فرمایا:

((أَنْظِرْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيدٍ))^(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب النظر الی المرأة قبل التزویج۔ وصحیح مسلم،

کتاب النکاح، باب فی الصداق وجواز کونه تعلیم القرآن وخاتم حدید۔

”مہر کے لیے کچھ تلاش کرو چاہے لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔“

مہر کی دو اقسام ہیں:

(۱) مہر معجل: اگر مہر عقد نکاح کے وقت ہی ادا کر دیا جائے تو ”معجل“ کہلاتا ہے۔

(۲) مہر مؤجل: اگر مہر کا کُل یا کچھ حصہ تاخیر کے ساتھ ادا کیا جائے تو وہ ”مؤجل“

کہلاتا ہے۔

مہر کتنا ہونا چاہیے اس کی شریعت میں کوئی حد مقرر نہیں ہے، لیکن مہر میں تخفیف مستحب

ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((اِنَّ اَعْظَمَ النِّكَاحِ بَرَكَهٌ اَيْسَرُهُ مُؤْنَةً))^(۱)

”وہ نکاح سب سے زیادہ بابرکت ہے جو آسان ترین ہو۔“

ہمارے ہاں عام طور پر مرد حضرات عورتوں کا حق مہر ادا نہیں کرتے۔ نکاح کے موقع پر

زیادہ مہر لکھوایا جاتا ہے جو کہ بعد میں خاوند کے لیے ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اب بیوی دباؤ

کی وجہ سے خاوند سے اس کا مطالبہ بھی نہیں کرتی۔ اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے اس کا

مطالبہ کرے تو اس کو اخلاقاً برا سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ مہر خاوند کے ذمہ

قرض ہے اور واجب الادا ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی میں ادا نہ کرے گا تو گناہ گار ہوگا اور اس کی

وفات کے بعد اس کے ترکے میں سے عورت کو حق مہر ادا کیا جائے گا۔ ہاں اگر بیوی بغیر کسی

دباؤ کے حق مہر میں سے اپنے خاوند کو کچھ معاف کر دے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن ہمارے

ہاں صورت حال یہ ہے کہ عورتوں کو عموماً اندازہ ہوتا ہے کہ خاوند نے مہر ادا تو کرنا نہیں ہے

اس لیے وہ معاف کرنے میں ہی عافیت سمجھتی ہیں۔

(۴) ایجاب و قبول: ایجاب و قبول بھی نکاح کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ ایجاب

کے معنی واجب کرنے کے ہیں اور قبول کے معنی قبول کرنے کے ہیں۔ لڑکی کا ولی ایجاب کرتا

ہے جبکہ لڑکا اس کو قبول کرتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لڑکی کا ولی کس چیز کا ایجاب

کرتا ہے، یعنی کس چیز کو واجب کرتا ہے؟ دراصل ولایت ایک ذمہ داری ہے۔ نکاح سے پہلے

لڑکی کے نان و نفقہ اور دیگر معاملات کا شرعی ذمہ دار اُس کا ولی (باپ) ہوتا ہے۔ نکاح کے

موقع پر ولی (باپ) یہ ذمہ داری اس کے ہونے والے خاوند کو سونپ دیتا ہے۔ اگر وہ اس

ذمہ داری کو قبول کر لے تو نکاح ہو جاتا ہے۔

(۱) مسند احمد، الامام احمد بن حنبل، ۸۲/۶، دار احیاء التراث العربی بیروت۔

ایجاب و قبول سے متعلق مسائل اور بدعات و رسومات:

(۱) ایجاب و قبول کے لیے لڑکی کا ہونا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی ایجاب و قبول کے موقع پر لڑکی کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔

(۲) ولی (جو کہ عموماً لڑکی کا باپ ہوتا ہے) لڑکی سے اس کے نکاح کے بارے میں پہلے سے ہی اجازت لے لیتا ہے لہذا ایجاب و قبول کے موقع پر لڑکی کی طرف سے ایجاب اس کا ولی کرتا ہے جبکہ قبولیت کے لیے لڑکے کا ہونا ضروری ہے۔ باپ کی عدم موجودگی کی صورت میں ولی کو چاہیے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح سے پہلے ہی لڑکی سے اجازت لے لے۔ بعض دیہی علاقوں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ شادی کے موقع پر مولوی صاحب لڑکی سے اس کی رضا مندی پوچھنے کے لیے اس کے پاس چلے جاتے ہیں اور اس بہانے دلہن کا دیدار بھی کر آتے ہیں۔ یہ ایک خلاف شریعت فعل ہے۔ مولوی صاحب کو لڑکی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ لڑکی کا ولی اس کے قائم مقام ہوتا ہے لہذا اس کی اجازت ہی لڑکی کی اجازت شمار ہوتی ہے۔

بڑے شہروں میں جہاں شادی کی محافل عموماً بڑے بڑے شادی ہالوں میں منعقد ہوتی ہیں وہاں نکاح کے وقت لڑکا اور لڑکی سبچ پر ایک ساتھ ہوتے ہیں جبکہ لڑکی کی بے پردگی ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی رسم ہے جو کہ اسلامی معاشرت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔

نکاح کی جگہ اور وقت کا تعین:

نکاح کے لیے شریعت میں کوئی وقت اور جگہ متعین نہیں ہے۔ ماہِ محرم میں نکاح کو بعض لوگ ناپسند کرتے ہیں حالانکہ شریعت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جو کہ ماہِ محرم میں نکاح کی ممانعت کو بیان کرے۔ لہذا کسی بھی مہینے میں دن یا رات کے کسی بھی وقت نکاح کیا جاسکتا ہے۔

مسجد میں نکاح کی شرعی حیثیت اور اس کے فوائد:

نکاح کی جگہ کے بارے میں حضور ﷺ سے ایک روایت ہے:

((أَعْلِنُوا هَذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوهُ فِي الْمَسْجِدِ))^(۱)

”نکاح کا اعلان عام کیا کرو اور اس کو مسجدوں میں منعقد کرو۔“

(۱) جامع الترمذی، کتاب النکاح، باب اعلان النکاح۔

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے^(۱) لیکن اگر غور کیا جائے تو مسجد میں محفل نکاح کے منعقد ہونے میں بہت سارے فوائد ہیں۔ چونکہ مسجد ایک بابرکت جگہ ہے لہذا ایسی محافل کے انعقاد کے لیے موزوں ترین ہے۔ علاوہ ازیں مسجد میں نکاح کے انعقاد سے اس موقع پر ہونے والی بہت ساری خرافات مثلاً گانا بجانا، سگریٹ نوشی، ویڈیو ہونا، مخلوط معاشرت اور رقص و سرود کی محفلوں سے بچا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے مسجد کا ہونا اگرچہ نکاح کے لیے شرط تو نہیں ہے لیکن بہتر و احسن ضرور ہے۔

نکاح کا طریقہ کار

جب لڑکے اور لڑکی والوں کے درمیان نکاح کے لیے ایک وقت اور جگہ مقرر ہو جاتی ہے تو اس موقع پر فریقین کی طرف سے رشتہ دار اور دوست احباب اکٹھے ہوتے ہیں۔ لڑکی کی طرف سے اس کا ولی حاضر ہوتا ہے جبکہ لڑکا بذات خود موجود ہوتا ہے۔ کوئی بھی عالم (ہمارے ہاں عرف میں عموماً لڑکی والے اس کا تعین کرتے ہیں) خطبہ نکاح پڑھتا ہے جو کہ مسنون ہے۔ اس کے الفاظ کچھ اختلاف کے ساتھ مختلف روایات اور احادیث کی کتب میں مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکی کے ولی سے وہ عالم اجازت لیتا ہے اور اس کا نکاح مقرر شدہ مہر کے عوض اس کے ہونے والے خاوند سے کر دیتا ہے۔

نکاح کے موقع پر بعض رسومات اور ان کا شرعی حکم

(i) نکاح کے موقع پر لڑکے سے چھ کلمے پڑھوانا، جیسا کہ عموماً دیہاتوں میں رواج ہے، ایک غیر شرعی رسم ہے۔ اسلام کا کلمہ تو ایک ہی ہے، اور وہ کلمہ شہادت ہے۔ نکاح کے موقع پر تجدید اسلام کی اس رسم کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر لڑکے کے بارے میں یہ ظن یا گمان ہو کہ اس کو کلمہ شہادت تک صحیح نہ آتا ہوگا تو ایسی صورت میں اس سے کلمہ شہادت پڑھوا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(ii) نکاح کے موقع پر چھوہارے وغیرہ تقسیم کرنا یا بائٹنا مسلمانوں کے ہاں عرفاً ثابت ہے، اس لیے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ایسی رسم یا رواج جو کہ خلاف شرع نہ ہو جائز ہے۔

(iii) اگر کچھ بھانڈیا میراثی وغیرہ اکٹھے ہو جائیں تو ان کو بھگا دینا چاہیے۔ عموماً یہ لوگ فحش لطیفوں

(۱) سبیل السلام، علامہ محمد بن اسماعیل الصنعانی، جلد ۳، ص ۱۱۶، مطبعة احیاء التراث العربی، بیروت۔ تحفة الاحوذی، علامہ عبدالرحمن مبارکپوری، ج ۲، ص ۱۷۰، مطبعة نشر السنة ملتان۔

- اور گانوں کے ذریعے لوگوں کو محفوظ کر کے پیسے بٹورتے ہیں جو کہ ایک حرام کام ہے۔
- (iv) دولہا کو پیسوں کے ہار وغیرہ پہنانا شرعاً ناجائز ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ ہاں پھولوں کے ہار پہنائے جاسکتے ہیں۔
- (v) نکاح کے دن دولہا کا مقامی دربار پر جا کر حاضری دینا اور اس کا طواف کرنا ایک مشرکانہ عمل ہے؛ جبکہ مقامی مسجد کی زیارت کر کے اس میں دو رکعت نفل نماز ادا کرنا سنت سے ثابت نہیں ہے۔
- (vi) دولہا کا گلہ یا دستار پہننا، مخصوص لباس پہننا یا گھوڑی چڑھنا، یہ ہمارے معاشرے کے ایسے رواجات ہیں جن کے جائز ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ان کا تعلق عرف سے ہے۔

رسم و رواج (عرف) کے بارے میں چند اصول و ضوابط

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر ہونے والی ہر رسم کو ہم بدعت یا حرام نہیں قرار دے سکتے۔ کسی رسم و رواج کے جائز ہونے کی کیا شرائط ہیں، فقہاء نے اصول کی کتابوں میں ان پر تفصیلاً بحث کی ہے۔ ذیل میں ہم ان کا خلاصہ پیش کیے دیتے ہیں۔ ایک رواج اس صورت میں جائز ہوگا جبکہ اس میں درج ذیل شرائط پائی جائیں:

(۱) رواج نص کے مخالف نہ ہو۔ مثلاً شادی کے موقع پر ویڈیو بنوانا یا مخلوط معاشرت اور رقص و سرود کی محفلیں سجانا وغیرہ۔

(۲) رواج مطرد اور غالب ہو۔ یعنی کوئی رواج لوگوں میں عام یا مشہور ہو اور اس سے متعلق طبقہ کے لوگ اس سے واقف ہوں، ایسا نہ ہو کہ کوئی واقف نہ ہو۔ غالب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ رواج اکثر جگہوں پر پایا جاتا ہو اور اکثر ایسا ہی رواج ہو؛ بہت کم اس کے خلاف کوئی دوسرا طریقہ ملتا ہو۔

(۳) وہ رواج جس پر کسی معاملے یا تصرف کو محمول کیا جائے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس معاملے کے وقت موجود ہو، یعنی عرف اس معاملے سے پہلے وجود میں آیا ہو۔

(۴) کوئی ایسا قول یا فعل موجود نہ ہو جو کہ رواج کے خلاف ہو۔^(۱)

(۵) اس رسم یا رواج میں غیر مسلم اقوام کی مشابہت نہ ہو۔ جیسے مہندی کی رسم بہر حال ان شرائط خمسہ کی روشنی میں مسلمان معاشرے میں کسی بھی معروف رواج کی شرعی حیثیت کو ہم متعین کر سکتے ہیں۔

(۱) جامع الاصول، ڈاکٹر احمد حسن اردو ترجمہ ”الوحی فی اصول الفقہ“ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، مطبع نجیبائی پاکستان لاہور، ص ۲۰۰ تا ۲۰۲۔